آؤ لوگو کہ یہیں نور خدا پاؤ گے * لو تمہیں طور تسلّی کا بتایا ہم نے

ریویو آف ریلیجنز

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر

جلد ۵ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۰۶ء | نمبر ۹

فہرست مضامین

قادیان ضلع گورداسپور سے ۲۰ ستمبر ۱۹۰۶ء کو منیجر میگزین کے اہتمام سے شایع ہوا۔ چندہ سالانہ للعہ

رؤیا والہامات حضرت مسیح موعود علیہ السلام

۲۱۔ اگست ۱۹۰۶ء۔ ۱۔ شب گذشتہ کو مَیں نے خواب میں دیکھا کہ اس قدر زنبور ہیں (جن سے مراد کمینہ دشمن ہیں) کہ تمام سطح زمین اُن سے پُر ہے اور ٹڈی دل سے زیادہ انکی کثرت ہے اسقدر ہیں کہ زمین کو قریباً ڈھانک دیا ہے اور تھوڑے اُنہیں سے پرواز بھی کر رہے ہیں جو نیش زنی کا ارادہ رکھتے ہیں مگر نامراد ہے اور مَیں اپنے لڑکوں شریف اور بشیر کو کہتا ہوں کہ قرآن شریف کی یہ آیت پڑھو اور بدن پر پھونک لو کچھ نقصان نہیں کریں گے اور وہ آیت یہ ہے **واذا بطشتم بطشتم جبارین**۔ پھر بعد اس کے آنکھ کھل گئی۔ ۲۔ الہام ہوا **نصرت بالرعب و قالوا لات حین مناص**۔ ترجمہ۔ رُعب کے ساتھ تیری نصرت کی گئی اور مخالفوں نے کہا اب کوئی جائے پناہ نہیں۔ ۳۔ قریباً نصف رات کے بعد الہام ہوا۔ صبر کر خدا تیرے دشمن کو ہلاک کریگا۔ ۲۳۔ اگست ۱۹۰۶ء۔ الہام۔ آج کل کوئی نشان ظاہر ہوگا۔ یعنی عنقریب کوئی نشان ظاہر ہونے والا ہے۔ ۲۵۔ اگست ۱۹۰۶ء۔ الہام **شفیع اللہ**۔ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے یہ میرا نام رکھا ہے اور اس کے معنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کا شفیع۔ ۴۔ ستمبر ۱۹۰۶ء الہام۔ **انی مع الروح اٰتیك بغتۃً**۔ ترجمہ۔ مَیں روح کے ساتھ اچانک تیرے پاس آؤنگا۔ رؤیا۔ فرمایا آج ہی ایک خواب میں دیکھا کہ "ایک چوغہ زریں جس پر بہت سنہری کام کیا ہوا ہے مجھے غیب سے دیا گیا ہے۔ ایک چور اُس چوغہ کو لیکر بھاگا۔ اُس چور کے پیچھے کوئی آدمی بھاگا جس نے چور کو پکڑ لیا اور چوغہ واپس لے لیا بعد اس کے وہ چوغہ ایک کتاب کی شکل میں ہو گیا جسکو تفسیر کبیر کہتے ہیں۔ اور معلوم ہوا کہ چور اسکو اس غرض سے لے کر بھاگا تھا کہ اس تفسیر کو لیکر نابود کر دے" فرمایا اس کشف کی تعبیر یہ ہے کہ چور سے مراد شیطان ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ ہماری ملفوظات لوگوں کی نظر سے غائب کر دے مگر ایسا نہیں ہوگا۔ اور تفسیر کبیر جو چوغہ کے رنگ میں دکھائی گئی اسکی یہ تعبیر ہے کہ وہ ہمارے لیے موجب عزت اور زینت ہوگی۔ واللہ اعلم

۵۔ ستمبر ۱۹۰۶ء۔ رؤیا میں دیکھا کہ ڈاکٹر عبد الحکیم (جو اب مرتد ہوگیا ہے اور سخت معاند سلسلہ ہے) ہمارے مکان کے پاس کھڑا ہے اور والدہ میر محمد اسحاق (زوجہ میر ناصر نواب صاحب) اسکو اپنے گھر میں بلاتی ہیں۔ مگر مَیں نے اسے اندر آنے نہیں دیا۔ اور مَیں نے کہا کہ مَیں نہیں آنے دینا اس میں ہماری بے عزتی ہے (دشمن کے گھر میں داخل ہونے سے مراد کوئی مصیبت یا موت ہوتی ہے اور وہ اندر نہیں آسکا یعنی خدا نے اس بلا کو ٹالدیا) پھر الہام ہوا۔ **انی احافظ کل من فی الدار** (مَیں ان سب کی حفاظت کرونگا جو اس گھر میں ہیں) یہ الہام حضرت اقدس ؑ کو پہلے بھی طاعون کے متعلق ہو چکا ہے۔ علاوہ اس کے ایک گوشت کا ٹکڑا خواب میں دکھایا گیا۔ جو کسی غم کی طرف دلالت کرتا تھا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ ایک انڈا میرے ہاتھ میں ہے جو کہ ٹوٹ گیا ہے۔ ان سب خوابوں پر ایک دن گذرنے پایا تھا کہ محمد اسحاق میر ناصر نواب صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

احادیث کی صداقت پر تاریخی شہادت

احادیث کی صداقت پر ایک شہادت میں نے گذشتہ رسالے میں پیش کی ہے۔ اس مضمون میں میں صرف ایسی شہادت پیش کرونگا جو اپنے اندر تاریخی ثبوت رکھتی ہے۔ نہ صرف شریعت اسلامی کی بنیاد ہی قرآن شریف کے بعد حدیث نبوی پر رکھی گئی ہے۔ بلکہ اسلام کی ابتدائی تاریخ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح اور آپ کی پیشگوئیوں کا بڑا بھاری ذخیرہ قرآن کریم کے بعد حدیث میں ہی پایا جاتا ہے۔ اور اس لیے ضروری ہے کہ اس امر میں کہ حدیث کہاں تک قابل اعتبار ہے نظر غائر کیجاوے اس قسم کی تحقیق و تدقیق کی ضرورت اور بھی زیادہ ثابت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عیسائی صاحبان نے اس بارہ میں سخت ٹھوکر کھائی ہے اور اس وجہ سے کہ انکے دلوں میں اسلام کے خلاف ایک سخت تعصب جما ہوا ہے انہوں نے احادیث کے قابل اعتبار ہونے پر سخت حملے کیے ہیں اور زیادہ تر عجیب بات یہ ہے کہ جب خود احادیث سے واقعات کو اخذ کیا ہے تو کمزور سے کمزور بلکہ غلط اور موضوع احادیث کو صحیح احادیث پر ترجیح دی ہے صرف اس لیے کہ تا اسلام یا بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر حملہ کرنے کیلیے کوئی موقع ہاتھ آجائے۔ عیسائی صاحبان کی تعصب کی وجہ سے یہ حالت ہے کہ ان کی تحریروں میں عجیب رنگ کا تضاد پایا جاتا ہے۔ جب یہ لوگ احادیث کے اعتبار اور صداقت کے متعلق اصول تجویز کرتے ہیں تو اس وقت اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیثوں کو بھی پایۂ اعتبار سے ساقط دکھانا چاہتے ہیں اور جب کوئی اپنے مطلب کی حدیث ہاتھ آجائے جس سے ان کے زعم میں اسلام یا بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حملہ ہو سکے تو اُن احادیث کو بھی اپنی کتابوں میں خوشی سے درج کر دیتے ہیں جن کی نسبت محدثین نے بالاتفاق شک ظاہر کیا ہوتا ہے بلکہ جنکو انہوں نے غلط اور موضوع قرار دیا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں سر ولیم میور کی کتاب کا حوالہ دیتا ہوں۔ میور کی لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) انگریزی زبان میں اعلیٰ درجہ کی مستند اور معتبر کتاب تسلیم کیجاتی ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں احادیث کو بالکل پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ثابت کرنا چاہا ہے۔ حتیٰ کہ بخاری جیسی کتاب جو اہل اسلام میں حدیث کی سب سے زیادہ معتبر کتاب تسلیم کیگئی ہے

اس کے متعلق میور صاحب لکھتے ہیں کہ اگرچہ امام بخاری نے چھ لاکھ حدیث میں سے صرف چار ہزار کی صحت پر پورا اعتبار کر کے انکو اپنی کتاب میں لکھا ہے لیکن اس منتخب تعداد میں سے بھی یورپین منتقد بلا تامل آدھی حدیثوں کو رد کردیگا۔" یورپین منتقد بلا تامل ایسا کرے یا بغیر سوچنے کے اور پرکھنے کے اس سے مجھے اسوقت بحث نہیں ہے مگر حیرت اس بات پر آتی ہے کہ یہی یورپین منتقد جو اپنے آپ کو اس موقع پر ایسا عظیم الشان محقق ظاہر کرتا ہے کہ بخاری جیسی صحیح کتاب میں سے جو تمام مسلمان منتقدوں کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ آدھی حدیثوں کو بلا تامل رد کرتا ہے۔ تھوڑی ہی دور آگے چلکر واقدی جیسی کتاب کی حدیثوں کو اپنے اعتراضوں کی تائید میں پیش کرتا ہے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک روایت کے رو سے بالکل اعتبار سے گرا ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ ایک ایسے شخص کی نسبت جسکی تحقیق سب کے نزدیک مسلّم ہے یہ رائے ظاہر کیجاتی ہے کہ اس کی آدھی حدیثیں بلا تحقیق رد کردینی چاہییں اور پھر اس کے مقابل پر اعتبار اس شخص کی حدیثوں پر کیا جس کی روایت اہل اسلام کے علما اور محققین کے نزدیک پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ہے۔ میور صاحب کے اس اصل کا مقتضی جو اس نے دیباچہ میں بیان کیا ہے یہ تھا کہ وہ بخاری کی حدیثوں کو بھی بہت چھان بین کے بعد قبول کرتا مگر برعکس اس کے اس نے نہایت ضعیف حدیثوں سے اپنی کتاب میں کام لیا ہے، حالانکہ بخاری میں ان احادیث کی تردید بھی موجود ہے۔ یہی حالت ان تمام مصنفین کی ہے جنہوں نے اسلام پر کتابیں لکھی ہیں۔ یعنی اعلیٰ درجہ کی صحیح احادیث کو یہ لوگ رد کرتے ہیں۔ اور انکے خلاف ضعیف اور موضوع احادیث کے قصص کو قابل اعتبار ٹھہراتے ہیں۔ اور پھر تعجب یہ ہے کہ اس ترجیح کی وجہ کوئی بیان نہیں کرتے پس ایسے شخصوں کی تحریروں کی مسلمان محققین کے نزدیک کیا وقعت ہو سکتی ہے ہاں عیسائی دنیا کو خوش کرنے کا کام یہ کتابیں ضرور دیتی ہیں۔

اس سوال کو صحیح طور پر حل کرنے میں کہ احادیث نبوی کہانتک قابل اعتبار ہیں۔ اہم بحث ہماری راہ میں یہ ہے کہ آیا اسلام کے نہایت ابتدائی زمانہ میں احادیث کی حفاظت اور ٹھیک ٹھیک دوسروں تک پہنچانے کا کوئی سامان تھا؟ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسے سامان موجود تھے۔ یا خود آنحضرتؐ نے ہی ایسی ہدایات بیان فرمائی تھیں جنسے احادیث کی حفاظت اور صحیح طور پر دوسروں تک پہنچانیکا ثبوت ملتا ہے تو پھر ایسے لغو اعتراضات جنکی بنا تاریخ پر نہیں بلکہ توہم پر ہے کہ یوں ہو گیا ہو گا اور ووں ہو گیا ہو گا جیسا کہ میور صاحب لکھتا ہے ایسے اعتراضات کی لغویت خود ہی ایک ثابت شدہ امر ہو گی اور انپر مزید بحث کرنیکی ضرورت نہ رہیگی۔ یہ سوال جو اسجگہ میں نے اٹھایا ہے اور جو درحقیقت ساری بحث کی جان ہے یہ سوال معترضین نے کبھی اٹھایا ہے اور نہ اسے حل کرنیکی کوشش کی ہے اور میرا یقین ہے کہ اگر وہ سیدھی راہ کو اختیار کرتے تو اسقدر غلطیوں میں کبھی مبتلا نہ ہوتے۔ البتہ میور نے اصول صحت حدیث بیان کرتے وقت ایک رنگ میں ان باتوں کا

انکار کیا ہے کہ آنحضرتؐ کے وقت میں یا آپ کی ہدایت سے حدیث کی حفاظت یا صحت روایت کا کوئی سامان موجود تھا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ حدیث پر عمل کی ضرورت اُسوقت پڑی جب بعد کے زمانے میں فتوحات اسلامی کا میدان وسیع ہو جانیسے قرآن شریف اتنی بڑی سوسائٹی کے لیے جو ہر طرف ملکوں میں پھیل گئی تھی کافی نہ پایا گیا۔ گو یا وہ اسبات سے انکار کرتا ہے کہ زمانہ نبوی میں بھی صحابہؓ حدیث پر عمل کرتے یا حدیث پر عمل کو انکی ضرورت سمجھتے تھے پس جب حدیث کی کوئی وقعت اس زمانے میں نہ تھی تو اس کی حفاظت یا صحیح طور پر ایک سے دوسرے کو پہنچانیکی ضرورت بھی نہ تھی اور جب ضرورت نہ تھی تو سامان بھی حفاظت کا کوئی نہ ہوگا۔ یہ مَیں میور صاحب کے کلام سے استدلال کرتا ہوں ورنہ خود اس سوال کو کہ آیا حدیث کی حفاظت کا کوئی سامان زمانہ نبوی میں تھا یا نہیں میور زیر بحث نہیں لایا۔ مگر چونکہ اس سوال کو کہ حدیث کی کوئی وقعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھی یا نہیں؟ اس سوال سے بڑا گہرا تعلق ہے کہ حدیث کی حفاظت کا کوئی سامان بھی اس زمانہ میں تھا یا نہیں؟ اس لیے مَیں پہلے سوال پر بھی غور کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ صحابہؓ کے نزدیک حدیث کی قدر و منزلت وہی تھی جو بعد میں محدثین کے نزدیک تھی تو ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے کہ کیوں انہوں نے حدیث کے یاد رکھنے اور اس کو صحیح طور پر پہنچانیکی کوشش نہ کی ہوگی۔ ہاں اگر یہ ثابت ہو کہ صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حدیث پر عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک حدیث کی قدر و منزلت کوئی نہیں تھی بلکہ جیسا کہ میور کہتا ہے حدیث کی ضرورت اسوقت پیش آئی اور اسکی قدر و منزلت اسوقت بڑھی جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو کر بہت سی نئی ضرورتیں پیش آئیں جنکے لیے قرآن کریم سے کوئی راہ نہ ملتی تھی تو ایسی صورت میں حدیث کی حفاظت کے سامان بھی اُس زمانہ یعنی زمانۂ نبوی میں کوئی نہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ جس چیز کی کوئی ضرورت نہ تھی اسکو کیوں یاد رکھا جاتا یا ٹھیک طور پر دوسروں تک پہنچایا جاتا۔ میور صاحب کا یہ دعویٰ کہ حدیث کو جزو شریعت بنانیکی ضرورت بعد میں پیش آئی اور کہ زمانۂ نبوی میں اسپر عمل کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود وحی یعنی قرآن کریم کے پابند تھے۔ ایک بے دلیل دعویٰ ہے۔ کیونکہ اسلامی شریعت ابتدا سے ہی اولاً قرآن کریم پر اور پھر سنت[*] یعنی افعال نبیؐ اور حدیث یعنی اقوال پیمبر پر جو ہر دو کلام الٰہی کے لیے بطور مفسر کے تھے مبنی تھی۔ مثلاً قرآن کریم مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ تم نماز پڑھو۔ لیکن نماز کے متعلق کل کے کل احکام اور اسکے پڑھنے کا طریق یہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنکا پاکیزہ قلب مورد وحی الٰہی ہونیکی وجہ سے کلام الٰہی کے اصل منشاء کو سمجھتا تھا بیان فرمائے اور یہی آپ کا بیان فرمانا یعنی اپنے عمل سے بتانا کہ نماز یوں پڑھنی چاہیئے یا قول سے تشریح کرنا کہ نماز کے متعلق یہ یہ احکام ہیں حدیث ہے جس کے بغیر اصل شریعت اسلامی مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہی دوسرے احکام قرآنی کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے۔ پس حدیث کی ضرورت وسعتِ سلطنت اسلامی کے ساتھ بعد میں نہیں پڑی بلکہ اسکی ضرورت بھی قرآن کریم

[*] سنت سے مراد آنحضرتؐ کا طریق عمل ہے کہ ہر فعل کو آپ نے پہلے خود کر کے دکھایا اور یہ بھی حدیث میں شامل ہے۔ منہ

کی ضرورت کے ساتھ ہی دست بدست چلتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک اخلاقی واعظ ہی نہ تھے بلکہ آپ شارع بھی تھے اور آپ کی رسالت کے ساتھ ہی نئی شریعت کی بنیاد بھی رکھی گئی پس آپ کے اقوال و افعال کی پیروی ابتدا سے ہی ہدایت کی راہوں پر چلنے کے لیے ضروری تھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اس ضرورت کو سب سے بڑھکر محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہر وقت آپ کے نقش قدم پر چلنے کے محتاج تھے۔

قرآن کریم خود اس امر پر شاہد ہے اور کھلے لفظوں میں اس نے یہ تاکید فرمائی ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کریں آپ کے احکام کو اسی طرح مانیں جس طرح احکام الٰہی کو مانتے تھے۔ کیونکہ فرماتا ہے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول۔ یعنی اللہ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی فرمانبرداری کرو۔ اگر اللہ کی فرمانبرداری سے مراد احکام الٰہی کی فرمانبرداری ہے جو بذریعہ قرآن کریم دیے گئے ہیں تو مقام غور ہے کہ رسول کی فرمانبرداری کیا مراد ہوئی۔ لازماً رسول کی فرمانبرداری سے ان احکام کی فرمانبرداری لینی پڑے گی جو رسول نے دیے ہیں اور جو قرآن کریم سے الگ ہیں کیونکہ قرآن کریم کے کل احکام کی فرمانبرداری اطیعوا اللہ میں داخل ہے پس یہ آیت قرآن کریم کی صریح گواہ ہے اس بات پر کہ قرآن کریم خود یہ ہدایت فرماتا ہے کہ رسول کے احکام کی یعنی حدیث کی پیروی کیجائے۔ اور اسکو قرآن کریم کی پیروی کی طرح لازمی قرار دیا گیا ہے۔ پس جو شخص قرآن شریف پر ایمان لاتا ہے اسکے لیے حدیث نبوی کی پیروی ضروری اور لازمی امر ہے۔ ایسا ہی دوسری جگہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ یاایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیءٍ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاٰخر۔ (نساء - ۵۹) اے ایمان والو اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ایسا ہی انکا جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں پھر اگر کسی امر میں تمھارا تنازع ہو جائے تو اس امر میں اللہ کے حکم اور رسول کے حکم کیطرف رجوع کرو۔ یہی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لانیکی شرط ہے۔ اس آیت میں بھی نہ صرف رسول کے حکم کی پیروی کو ایسا ہی ضروری قرار دیا گیا ہے جیسا کہ اللہ کے حکم کی پیروی کو۔ بلکہ یہ بھی فرمایا کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانیکی شرط ہی یہ ہے کہ ہر متنازعہ امر کا فیصلہ اللہ کے حکم کے رو سے اور رسول کے حکم کے رو سے کیا جائے یعنی قرآن اور حدیث کی رو سے۔ گویا ان دونو پر ایمان لائے بنا تنازعات کو انپر عرض کرنیکے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا۔ اب اسجگہ بھی غور کرلو کہ اللہ کی طرف کسی امر کو رد کرنیکے معنے سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتے کہ خدا کے کلام یعنی قرآن کریم کے رو سے اسکا فیصلہ کیا جاوے تو لازماً رسول کی طرف رجوع کرنیکے معنے یہی ہونگے کہ رسول کے حکم یعنی حدیث کے رو سے اسکا فیصلہ کیا جاوے۔ پھر اس سے بھی کھلے کھلے الفاظ میں رسول کے حکم کی پیروی کو ضروری بتایا اور کھول کر فرمایا کہ کوئی شخص مومن ہو سکتا ہی نہیں جبتک کہ رسول کے حکم کو سر تسلیم خم

کر کے نمانے فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ تیرے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے اور ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جبتک کہ اپنے تمام متنازعہ امور میں رسول کو ہی حکم قرار نہ دیں اور پھر جب رسول کوئی فیصلہ کرے تو اس کے قبول کرنے میں کسی طرح کی اپنے دلوں میں روک نہ پاویں بلکہ دل وجان اور پورے انشراح صدر سے ان احکام کو قبول کریں۔ پس اول تو ہمنے دکھایا ہے کہ ضرورت ہی ایسی واقعہ ہوئی تھی کہ صحابہ رض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پیروی کے بغیر اُس دین پر ہرگز قائم نہ ہو سکتے تھے جس کی طرف آپ اُنہیں بلاتے تھے پھر مزید براں یہ کہ قرآن کریم نے کھلے کھلے لفظوں میں اور بار بار تاکید سے یہ فرمایا کہ رسول کے احکام کی پیروی بھی ضروری ہے جیسے خدا کے احکام کی پیروی ضروری ہے یعنی قرآن اور حدیث دونوں کی پیروی کے بغیر انسان سچا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ تو ان واقعات کے ہوتے ہوئے اور ان احکام کی موجودگی میں صحابہ رضی اللہ عنہم کس طرح آپ کے اقوال و افعال سے غافل رہ سکتے تھے یا انکو بے توجہی کی نظر سے دیکھ سکتے تھے۔ یہ کبھی ممکن نہ تھا بلکہ انکے لیے تو آپ کا ہر قول اور فعل اپنے اندر ایک الٰہی رنگ رکھتا تھا اور علاوہ پیروی حکم کی ضرورت کے انکی محبتوں کا یہ تقاضا تھا کہ آپکے ہر قول اور فعل کو محبت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بلکہ معمولی سے معمولی باتوں میں آپکی پیروی کرتے تھے۔ مثلاً دیکھو حالانکہ انگوٹھی پہننا کوئی دینی امر نہ تھا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی پہنی تو اسی نقش کی انگوٹھیاں صحابہ رض نے بھی بنوائیں اور پہنیں۔ غرضکہ وہ ہر وقت اور ہر آن اسبات کے خواہاں تھے۔ کہ آپکے احکام اور اقوال کی تعمیل کریں اور آپکے افعال کی پیروی کریں۔ مسجد میں خطبہ پڑھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے ہیں کہ بیٹھ جاؤ۔ اسکی سبنے تعمیل کی یہانتک کہ ایک صحابی جو اسوقت مسجد کے ساتھ گلی میں سے گذر رہے تھے انکے کان میں بھی یہ آواز پڑی اور وہ وہیں بیٹھ گئے۔ کہ ایسا نہ ہو کہ مسجد میں پہنچنے سے پہلے میں مر جاؤں اور آپکے ایک حکم کی تعمیل سے قاصر رہوں۔ کیا ایسے مخلص معتقدین کے دل میں کبھی یہ خیال گذر سکتا تھا کہ آپکے احکام کی فرمانبرداری کی ضرورت نہیں؟ اور خود قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُسوہ حسنہ قرار دیکر صحابہ رض کو آپ کی ہر طرح سے پیروی کرنیکی تاکید فرمائی ہے۔ غرضکہ قرآن کریم سے یہی ثابت ہوتا ہے اور کلام الٰہی اس بات پر زور دیتا ہے کہ آپکے احکام یعنی حدیث کی پیروی ہر طرح سے کیجاوے اور صحابہ رض نے پیروی کی۔ اور حدیث اور سُنت کو اپنے دین کا جزو اور اپنی ہدایت کی راہ سمجھا۔

اس مختصر بحث سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رض آپکے اقوال و افعال کو بے توجہی کی نگاہ سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا یعنی آنحضرت صلی اللہ وسلم کے اقوال و افعال کی صحابہ رض کی نگاہ میں نعوذ باللہ کوئی وقعت نہ ہوتی۔ تو پھر اس قسم کے شکوک اور شبہات کہ حدیث محفوظ نہیں رہی اور ایک راوی سے دوسرے

راوی کے کانوں تک پہنچنے میں کچھ کی کچھ بن گئی قابل توجہ ہوتے۔ کیونکہ اس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ جن الفاظ کی طرف انکے بولے جانیکے وقت انکے سننے والوں کو کوئی توجہ نہ ہو اور جن واقعات پر انکے واقع ہونیکے زمانہ میں کسی نے غور نہیں کیا انکا کئی سال بعد اپنی اصلی صورت میں بیان کرنا ایک ایسا امر ہے جس کا آسانی سے یقین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حدیث کے متعلق ایک لمحہ کے لیے بھی صحابہؓ کو ایسی بے توجہی نہیں ہوئی آنحضرتؐ کے اقوال اور افعال وہ قواعد تھے جنپر چلنا وہ ہدایت کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ انکے بدلے انہوں نے اپنی جائدادیں اپنے گھر اپنے عزیز دوست اور اقربا اور اپنے وطن چھوڑے اور اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر بلکہ قربان کرکے اور طرح طرح کی تکالیف اُٹھا کر انکو قبول کیا۔ پھر کیا انہی کے متعلق وہ بے توجہ ہو سکتے تھے؟ ہرگز نہیں بلکہ آپ کے احکام تو انکے لیے زمین پر سب سے زیادہ قیمتی خزانے تھے۔ اور آپ کے ہر ایک قول اور فعل کو وہ پوری توجہ سے سنتے اور دیکھتے تھے۔

اب ہم حدیث پر غور کرتے ہیں کہ آیا حدیث میں اندرونی شہادت اس امر کی موجود ہے یا نہیں کہ اسکی حفاظت کے سامان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے احکام کے متعلق کیا تعلیم دی ہے۔ کتاب العلم میں امام بخاری نے یہ حدیث بیان کی ہے جو ابن عباس کی روایت سے ہے کہ جب قوم عبد القیس کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارے اور آپکے درمیان کفار ہیں یعنی ہمارا راہ انکے درمیان میں سے ہے پس ہم آپ کی خدمت میں سوائے مقدس مہینوں کے حاضر نہیں ہو سکتے۔ آپنے نماز روزے زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بیان فرمانیکے بعد انکو فرمایا۔ **احفظوہ واخبروہ من وراء کم**۔ یعنی خود ان باتوں کو خوب محفوظ رکھو یعنی اچھی طرح سے یاد کر لو اور جو لوگ تمہارے پیچھے رہ گئے ہیں انکو یہ باتیں صحیح صحیح پہنچا دو۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود حفاظت حدیث کا اور اسکو صحیح صحیح دوسروں تک پہنچانیکا حکم دیتے ہیں۔ اس سے بڑھکر اور کیا واضح ثبوت ہو سکتا ہے؟ ایسا ہی مالک بن حویرث روایت کرتے ہیں۔ قال لنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم **ارجعوا الیٰ اھلیکم فعلّموھم**۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ حکم دیا کہ اپنے گھروں میں واپس چلے جاؤ اور اپنے لوگوں کو یہ باتیں جو مَیں نے تمھیں سکھائی ہیں سکھاؤ۔ یہ بھی پہلی حدیث کی مؤید ہے۔ یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی نیا قبیلہ یا قوم ایمان لاتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ میں سے ایک شخص کو انکی طرف بھیجا کرتے تھے **تا وہ** انہیں انکے درمیان رہ کر احکام دین سکھا دے اور پوری طرح سے دین اسلام اور اسکی شریعت سے آگاہ کرے۔ ایسے لوگ ان نومسلموں کو نہ صرف قرآن کریم ہی سکھانے کے لیے بھیجے جاتے تھے بلکہ اس غرض سے کہ انکو سکھا دیں کہ کس طرح احکام دین کی پیروی کرنی چاہیئے۔ ایسے لوگ لازماً خود ایسے ہوتے تھے جو قرآن کریم کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے بھی اچھی طرح واقف ہوں تا ان لوگوں کو جنکی طرف وہ بھیجے جاتے تھے احکام دین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل سکھا دیں

ص یا صحابہؓ نے کوئی گُر سکھے یا نہیں۔ سب سے اول یہ دیکھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

(غرض) پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ تاکیدی حکم تھا کہ آپ کے اقوال کو یاد رکھا جائے اور دوسروں کو صحیح پہنچایا جائے بلکہ مختلف اقوام میں جو وقتاً فوقتاً اسلام میں داخل ہوتی تھیں آپ کا واعظین کو بھیجنا (تاکہ وہ ان کو احکام دین سکھا دیں) یہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں ہی اس پر عمل بھی کروایا۔ اور چونکہ واعظین جو ان نئی اسلام میں داخل ہوئی ہوئی قوموں کی طرف بھیجے جاتے تھے جو کچھ ان لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال کے متعلق بتاتے تھے انکو خود بھی یہ موقعہ ملتا تھا کہ براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکی تصدیق کرلیں۔ اس لیے ایسی احادیث ہر قسم کی غلطی اور آمیزش سے خالی تھیں۔ کیونکہ ایسے وقت میں جب چھوٹے چھوٹے معاملات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں وہ لوگ عرض کیا کرتے تھے یہانتک کہ آپ نے ایک امام مقرر کیا تو اس کے متعلق یہ شکایت آپ کے سامنے آئی کہ یہ قرأت لمبی پڑھتا ہے ایسی صورت میں یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ ان احادیث میں جو اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ہی دوسروں تک پہنچنی شروع ہوگئی تھیں کسی قسم کا تصرف ہوا ہو۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود واعظین کو مختلف اقوام کے اندر بھیجنا تاکہ وہ انکو دین حق سے اور آپ کے حالات سے آگاہ کریں یہ حدیث کی حفاظت کے سامانوں میں سے پہلا سامان تھا۔

اوپر میں یہ بھی دکھا چکا ہوں کہ جب ایک قوم آپ کے سامنے آتی تو آپ انکو چند احکام دین سکھانے کے بعد یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ انکو یاد رکھو اور اپنے لوگوں کو انسے آگاہ کرو۔ اور کئی احادیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ حدیث کو صحت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہمیشہ بہت تاکید فرمایا کرتے تھے۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے یہ حدیث بیان کی ہے۔ عن ابن مسعود قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول نضّر اللہ امرأً سمع مناشیئاً فبلّغہٗ کما سمعہٗ فربّ مبلّغ اوعی لہ من سامع۔ یعنی ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی کو سرسبز کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی پھر جس طرح اس کو سنا تھا بعینہٖ اسی طرح اسکو دوسروں کو پہنچایا کیونکہ بعض وہ لوگ جنکو باتیں پہنچائی جاتی ہیں اصل سننے والوں سے اس بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی امام بخاری بھی اسی مضمون کی ایک حدیث بیان کرتے ہیں۔ عن عبد الرحمٰن بن ابی بکرۃ عن ابیہ ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم قعد علی بعیرہ وامسک انسانٌ بخطامہ او بزمامہ قال ای یوم ھٰذا فسکتنا حتّٰی ظننا انہ سیسمیہ سوی اسمہ قال الیس یوم النحر قلنا بلٰی قال فای شھر ھٰذا فسکتنا حتّٰی ظننا انہ سیسمیہ بغیر اسمہ فقال الیس بذی الحجۃ قلنا بلٰی قال فان دماءکم واموالکم واعراضکم بینکم حرام کحرمۃ یومکم ھٰذا فی شھرکم ھٰذا فی بلدکم ھٰذا لیبلغ الشاھد الغائب فان الشاھد عسٰی ان یبلغ من ھو اوعی لہ

منه - یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سوار تھے اور ایک آدمی نے مہار پکڑی ہوئی تھی۔ آپ نے سوال کیا یہ کونسا دن ہے ہم خاموش رہے یہانتک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اسکا کوئی اور نام بتائیں گے آپ نے فرمایا کیا یہ یوم النحر نہیں یعنی ذوالحج کی دسویں تاریخ ہم نے عرض کیا ہاں۔ پھر آپ نے سوال کیا یہ کونسا مہینہ ہے۔ ہم خاموش رہے یہانتک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اسکا کوئی اور نام بتائیں گے۔ آپ نے فرمایا کیا یہ ذوالحج کا مہینہ نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا ہاں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری عزت تمہاری درمیان ان سب کو وہی حرمت حاصل ہے جو تمہارے اس شہر میں اس مہینے کے اندر اس دن کو حاصل ہے چاہیئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو میری بات پہنچا دے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے شخص کو خبر پہنچا دے جو شاہد کی نسبت بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والا ہے۔ آخری حصہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ تاکید پائی جاتی ہے کہ آپ کی باتیں دوسروں کو پہنچائی جاویں اور اس بات کا ذکر کہ شائد وہ لوگ سننے والوں کی نسبت بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوں اس لیے کیا گیا ہے کہ ان غائبین کا جو صحابہؓ سے آنحضرتؐ کی باتیں سنیں پھر یہ فرض ہے کہ وہ انکو یاد رکھکر دوسروں کو وہی باتیں پہنچا دیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا ماحصل یہ ہے کہ آپ کی باتیں یعنی حدیث نبوی ضایع نہ ہو بلکہ ایک دوسرے کو مسلمان اسے پہنچاتے رہیں۔ یہ دوسری شہادت اس امر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے اور صحابہؓ کو بار بار آپ نے یہ تاکید فرمائی کہ آپ کی حدیث بلا تغیر تبدل دوسرے لوگوں تک پہنچائی جاوے۔

بہت سی حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض ضروری باتوں کو تین تین دفعہ دوہرایا کرتے تھے تا کہ سننے والے اچھی طرح آپ کی بات کو سمجھ جائیں۔ عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه کان اذا تکلم بکلمة اعادھا ثلثا حتّٰی تفھم عنه واذا اتٰی علٰی قوم فسلم علیھم سلم علیھم ثلثا۔ یعنی تین دفعہ بیان کرنیسے غرض آپ کی یہ ہوتی تھی کہ سننے والا آپ کی بات کو سمجھ جائے۔ دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ کو جب ایک بات سمجھ میں نہ آئے تو خود دوبارہ سہ بارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیتے تھے۔ ابن ابی ملیکه کی روایت بخاری میں ہے ان عائشة زوج النبی صلی اللہ علیه وسلم کانت لا تسمع شیئًا لا تعرفه الا راجعت فیه حتّٰی تعرفه۔ یعنی حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات بیان فرماتے اور وہ انکی سمجھ میں نہ آتی تو آپ بار بار پوچھتیں یہاں تک کہ اچھی طرح سے سمجھ لیں۔ اب ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ایک بات کو بار بار بیان کرنا تا کہ سننے والے اچھی طرح سمجھ لیں اور دوسری طرف خود صحابہؓ کا ایک بات کو آپ سے دریافت کرنا جب پہلی دفعہ بیان کرنے سے

سمجھ میں نہ آئے یہ دونوں امور اس بات پر شاہد ہیں کہ آپ حدیث کی صحت اور سمجھانے میں اور صحابہؓ اس کے محفوظ رکھنے اور سمجھنے میں پوری کوشش کرتے تھے۔ یہ تیسرا سامان حفاظت حدیث کا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہی پایا جاتا ہے۔

چوتھا سامان حفاظت حدیث کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ وعید تھے جو آپ نے حدیث میں جھوٹ بولنے والے کیلئے بیان فرمائے۔ عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم فمن کذب علیّ متعمدا فلیتبوء مقعدہ من النار (رواہ الترمذی) ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا مجھ سے صرف وہی حدیث بیان کرو جسکو تم جانتے ہو کہ میری حدیث ہے جو شخص مجھ پر عمداً جھوٹ بنائیگا وہ اپنی جگہ آگ میں سمجھے عن سمرۃ بن جندب والمغیرۃ بن شعبۃ قالا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حدث عنی بحدیث یریٰ انہ کذب فھو احد الکاذبین (رواہ مسلم) یعنی سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی حدیث بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹ ہے وہ کاذب ہے۔ بخاری میں بھی اسی مضمون کی روایتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے، قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تکذبوا علیّ فانہٗ من کذب علیّ فلیلج النار۔ اور سلمہ کی روایت ہے، قال سمعت النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقول من یقل علیّ مالم اقل فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ اسی مضمون کی روایتیں حضرت انس۔ ابو ہریرہ اور زبیر سے مروی ہیں۔ ان تمام روایتوں سے جو آٹھ دس صحابہؓ سے مختلف واسطوں سے ہم تک پہنچی ہیں یہ صاف ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ نے بہت مرتبہ صحابہؓ کو اس بات سے ڈرایا تھا کہ آپ کی طرف منسوب کر کے کسی غلط حدیث کو شایع کرنا کیسا خطرناک گناہ ہے۔

اگر اسی قسم کی احادیث کے مضمون کو اور بھی غور کی نظر سے دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہر وقت اس بات سے ترساں رہتے تھے کہ کوئی غلط لفظ انکے مونہہ سے نہ نکل جاوے اور اس لیے جبتک کسی حدیث کے متعلق انہیں یقین کامل نہ ہوتا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے تو وہ اسے بیان کرنیکی جرأت نکرتے تھے۔ بخاری میں یہ حدیث حضرت انس سے مروی ہے قال انس انہٗ لیمنعنی ان احدّث کم حدیثاً کثیرا ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال من تعمد علیّ کذباً فلیتبوأ مقعدہ من النار یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا کہ بہت سی حدیثیں بیان کرنے سے مجھے یہ بات روکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جو شخص جان بوجھکر مجھ پر جھوٹ بولیگا وہ آگ میں جائیگا۔ ایسا ہی عبد اللہ بن زبیر سے روایت ہے قال قلت للزبیر انی لا اسمعک تحدث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

كما يحدث فلان و فلان قال اما انى لم افارقه و لكن سمعته يقول من كذب علىّ فليتبوأ مقعده من النار۔ یعنی عبداللہ بن زبیر نے اپنے والد زبیر سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے میں آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح حدیثیں بیان کرتا ہوا نہیں سنتا جس طرح فلاں اور فلاں آدمی بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس کی یہ وجہ نہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا رہتا تھا لیکن میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مجھ پر جھوٹ بولیگا وہ آگ میں داخل ہوگا۔ حضرت زبیر کا اس سے مطلب یہ نہیں تھا کہ دوسرے لوگ جو حدیثیں بیان کرتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں بلکہ انہوں نے فرمایا کہ چونکہ جھوٹ کے متعلق سخت ممانعت اور وعید عذاب ہے اس لیے میں زیادہ حدیثیں بیان نہیں کرسکتا۔ کیونکہ انکے متعلق مجھے یقین کامل نہیں کہ آنحضرتؐ نے کیا فرمایا تھا۔ کذب کے معنوں میں صرف یہی داخل نہیں کہ کوئی شخص ایک خبر یا واقعہ کو غلط جانکر بیان کرے بلکہ کذب بمعنی خطا بھی آتا ہے۔ اور محاورہ عرب میں کذب کا استعمال ان معنوں میں بہت سے احادیث میں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔ یعنی جہاں کسی شخص نے غلط واقعہ بیان کیا حالانکہ وہ خود اسے غلط نہیں سمجھتا تھا تو اس کے متعلق لفظ كذب آیا ہے جسکی تشریح بالاتفاق اخطأ کی گئی ہے پس جن صحابہؓ کے متعلق یہ ذکر ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم ڈرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کذب نہ بولیں انکا یہ منشاء ہرگز نہ ہوسکتا تھا کہ ہم ڈرتے ہیں کہ جس کلام کو ہم نے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا اسکو عمداً آنحضرتؐ کی طرف منسوب نہ کردیں بلکہ ڈر اسی بات کا ہوسکتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ غلطی سے کوئی غلط لفظ یا قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوجاوے پس صحابہؓ آنحضرتؐ کی حدیث کی روایت کرنے میں پہلے درجہ کے محتاط تھے اور اس وعید کے سبب سے کہ جو کذب علی النبی کے متعلق وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکے تھے۔ وہ ایسی حدیث کے بیان کرنیکی بھی جرأت نہ کرتے تھے جس کے متعلق انہیں یہ اندیشہ ہو کہ غلط بیانی ہوجاویگی۔ اس وعید میں اور صحابہؓ کے اسکو روایات بیان کرنے وقت اس طرح مدنظر رکھنے میں ایک اور قطعی شہادت ملتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا پورا اہتمام اسبات کا کیا کہ آپ کی احادیث کے پہنچانے میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو۔ اور صحابہؓ نے آپ کی ان ہدایات پر پوری طرح عمل کرکے دکھایا۔

مذکورہ بالا احادیث کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حدیث کے سننے۔ اسکے سمجھنے اور اسکو محفوظ رکھنے میں سب صحابہؓ یکساں نہ تھے بعض کو زیادہ وقت آنحضرتؐ کی صحبت میں رہنا میسر آتا تھا بعض کو بہت کم۔ بعض فہم و فراست سے دوسروں کی نسبت زیادہ حصہ رکھتے تھے اور سب کی قوت حافظہ بھی برابر نہ تھی اسی فرق کی وجہ سے روایت حدیث میں بعض کا مرتبہ بعض سے زیادہ ہے۔ مثلاً بہت سے صحابی ایسے تھے کہ اپنے کام بھی کرتے تھے اور فرصت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ بعض نے باریاں مقرر

کی ہوئی تھیں جیساکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ آپنے ایک انصاری کے ساتھ جو آپ کا ہمسایہ تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنیکے لیے باری مقرر کی ہوئی تھی۔ ایک دن وہ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس دن کی خبریں اور وحی حضرت عمرؓ کو پہنچاتے اور دوسرے دن حضرت عمرؓ ایساکرتے۔ پھر بعض صحابہؓ ان سے بھی بڑھکر مشتاق اس بات کے تھے کہ سارا وقت ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے رہیں۔ انہیں میں ابوہریرہ بھی تھے جنکی حدیثیں دوسرے صحابیوں سے بہت زیادہ پائی جاتی ہیں ابوہریرہ کا اشتیاق حفاظت حدیث کا اسقدر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے خوب آگاہ تھے چنانچہ ایک موقعہ پر جب ابوہریرہ نے آنحضرتؐ سے یہ سوال کیا یارسول اللہ من اسعد الناس بشفاعتك یوم القیامۃ۔ تو آپنے قبل اس کا جواب دینے کے فرمایا لقد ظننت یا اباھریرۃ ان لا یسألنی عن ھذا الحدیث احد اول منك لما رأیت من حرصك علی الحدیث۔ یعنی آپنے فرمایا کہ اے ابوہریرہ میں اسوجہ سے کہ تمھارا اشتیاق حدیث کے لیے خوب جانتا ہوں اس بات کو جانتا تھا کہ تم ہی پہلے مجھ سے یہ سوال پوچھوگے۔ (صحیح بخاری کتاب العلم) ایساہی صحیح بخاری میں دوسری جگہ یہ روایت ابوہریرہ سے مروی ہے۔ قال ان الناس یقولون اکثر ابو ھریرۃ ولولا اٰیتان فی کتاب اللہ ما حدثت حدیثا ثم یتلوا ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات الی قولہ الرحیم ان اخواننا من المھاجرین کان یشغلھم الصفق بالاسواق وان اخواننا من الانصار کان یشغلھم العمل فی اموالھم وان اباھریرۃ کان یلزم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشبع بطنہ ویحضر مالا یحضرون ویحفظ مالا یحفظون۔ یعنی ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے۔ اور اگر قرآن کریم میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔ اور پھر آپ یہ آیتیں پڑھتے ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدی جن میں ہدایت اور بینات کے چھپانے پر سخت وعید آیا ہے۔ پھر فرمایا کہ بات یہ ہے کہ ہمارے بھائی جو مہاجرین تھے انکو تو بازار میں خرید و فروخت روکے رکھتی تھی اور ہمارے بھائی جو انصار میں سے تھے انکو اپنے کاروبار روکے رکھتے تھے اور ابوہریرہ کا یہ حال تھا کہ کھانا کھایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگا رہا۔ اور اس لیے وہ ایسے ایسے واقعات کو مشاہدہ کرتا تھا جنکو دوسرے صحابی نہیں کرتے تھے اور ایسی ایسی باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنکر یاد رکھتا تھا جنکو دوسرے یاد نہیں رکھتے تھے۔ پس بڑی بھاری وجہ کہ بعض صحابہؓ کی احادیث کم پائی جاتی ہیں اور بعض کی زیادہ یہی ہے کہ بعض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کا زیادہ اتفاق ہوتا تھا اور بعض کو کم۔

اسی کی تائید میں بخاری نے تاریخ میں اور حاکم نے مستدرک میں یہ روایت طلحہ بن عبید اللہ سے بیان کی ہے لا اشك انه سمع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما لا نسمع وذلك انه کان مسکینا لا شئ له ضیفا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایسا ہی ابن عمر کا یہ قول احمد اور ترمذی نے بیان کیا ہے۔ جو ابوہریرہ کے متعلق ہے۔ کنت الزمنا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واعرفنا بحدیثه۔ اور بخاری نے تاریخ میں اور بیہقی نے یہ روایت محمد بن عمارہ بن حزم سے کی ہے۔ انه قعد فی مجلس فیه مشیخة من الصحابة بضعة عشر رجلا فجعل ابو هریرة یحدثهم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالحدیث فلا یعرفه بعضهم فیراجعون فیه حتی یعرفوه ثم یحدثهم بالحدیث کذلك حتی فعل مرارا فعرفت یومئذ ان ابا هریرة احفظ الناس۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی لوگ کہا کرتے تھے کہ ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے چنانچہ ایک دن ابوہریرہ نے ایک ایسا کہنے والے سے پوچھا کہ کل عشاء کی نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کون کونسی سورتیں پڑھی تھیں تو وہ نہ بتا سکا۔ اور پھر آپ نے اسکو بتا دیا جس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوہریرہ کو ابتدا سے ہی یہ شوق تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق معمولی سے معمولی باتوں کو توجہ سے دیکھتے اور یاد رکھتے تھے۔

ان تمام واقعات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے علم کی اشاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ اور آپ کے سامنے ہی حدیثیں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں اور آپ نے ہی سخت وعید ان لوگوں کے لیے بیان فرمائے تھے جو آپ کی حدیث میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کریں۔ انہی تمام احتیاطوں کی وجہ سے صحابہؓ حدیث کے بیان کرنے میں پرلے درجہ کے محتاط تھے اور اس ڈر سے کہ شائد کوئی غلطی نہ ہو جائے وہ بغیر یقین کامل کے کسی حدیث کو بیان نہ کرتے تھے۔ جو لوگ صحیح احادیث کے بیان کرنے میں اس درجہ کے محتاط تھے انکی نسبت یہ وہم کرنا کہ انہوں نے وضعی حدیثیں بنا بنا کر پھیلائیں پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ میور صاحب کا خیال ہے اور یہ خیال محض ایک بے بنیاد دعویٰ ہے کہ کثرت سے حدیثیں جنگوں میں وضع کی گئیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک لڑائی سے دوسری لڑائی تک جو وقفہ ہوتا تھا اس وقفہ میں صحابہؓ کا یہی کام ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑائی ظاہر کرنیکے لیے آپ کی تعریف میں جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر ناواقف لوگوں کو جو آنحضرتؐ کے بعد اسلام میں داخل ہوئے تھے خوش کیا کرتے تھے۔ یہ خیال جو ایک متعصب دل نے محض اپنے آپ کو اور اپنے اندھے مخیالوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے دل سے ہی بنا لیا ہے اُسیوقت قبول کیا جا سکتا ہے جب تمام تاریخی واقعات پر خاک ڈالی جاوے اور محض خیالات کی پیروی کیجائے اور اگر ایسے ایسے بیہودہ خیالات کے تراش لینے سے تاریخ بن سکتی ہے تو پھر تمام صحیح اور سچی تاریخی

واقعات کی کوئی وقعت نہیں ہوسکتی۔ یہ لوگ اپنے ہی دماغ کے ایجاد کردہ خیالات سے تاریخی واقعات کو تاریکی میں ڈالنا چاہتے ہیں مگر وہ اگر چند دنوں کے لیے اپنے ہمخیالوں کو دھوکہ دے بھی لیں تو ہمیشہ کے لیے اپنے ناپاک مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ افسوس ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر حملہ کرتے وقت کہ وہ لڑائیوں میں حدیثیں بنا بنا کر لوگوں کو خوش کیا کرتے تھے نہ ہی میور نے کوئی دلیل اس دعوے کی پیش کی ہے اور نہ ہی کوئی نظیر دی ہے، اگر اس قسم کا بے دلیل دعویٰ کوئی شخص مسیح کے حواریوں کے متعلق کرے تو معلوم نہیں پادری صاحبان اسکو کسقدر کوسیں مگر اسلام پر کسی ناجائز حملہ کا کرنا وہ کچھ بھی عیب نہیں سمجھتے۔ علاوہ ازیں یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی حدیثیں وضع کرنیکی ضرورت صحابہؓ کو کوئی نہ تھی۔ ایسی باتوں کو وضع کرنیکی ضرورت تب پیش آتی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ ناکامی اور نامرادی کی حالت میں ذلیل اور خوار رہ کر دنیا سے اُٹھ جاتے مگر آپ کو وہ کامیابی اور عزت اور عظمت اپنی زندگی میں نصیب ہوئی جس کی نظیر ہمیں دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ زیادہ وضاحت کے لیے میں ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ عیسائی صاحبان کے اعتقاد کے بموجب حضرت مسیح ناکامی کی حالت میں اس دنیا سے اُٹھ گئے اور ان لوگوں کے دلوں پر جنکو وہ ساری عمر وعظ کرتے رہے انکی کوئی عظمت نہ بیٹھی٭۔ اس لیے اگر ان کے پیرو صرف وہی واقعات آپ کے متعلق پیش کرتے جنسے وہ ایک کمزور اور فانی انسان ثابت ہوتے تو انکو مسیحی دین کے پھیلنے کی کوئی امید نہ ہوتی کیونکہ جب وہ خود اپنی زندگی ناکامی کی حالت میں گذار کر ناکامی کی حالت میں ہی اُٹھ گئے اور انکی عظمت کسی پر ثابت نہ ہوئی اور نہ معدودے چند اشخاص کے سوائے کسی نے انکی صداقت کو تسلیم کیا تو بعد میں وہی باتیں پیش کرکے جو انکی اپنی زندگی میں کچھ اثر پیدا نہ کر سکیں انکے پیرو خود ان سے بڑھکر کسی کامیابی کی امید نہ رکھ سکتے تھے۔ اور نہ انہی باتوں سے کوئی نیا اثر پیدا کر سکتے تھے جو خود مسیح کی اپنی زندگی میں پیدا نہ ہوا۔ پس اگر وہ مسیح کی عظمت کیلیے نئی نئی باتیں تراش کر لوگوں کو نہ سناتے تو انکا مذہب بھی نہ پھیل سکتا تھا اس لیے مسیح کے پیروؤں کو تو یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ ایک کمزور اور عاجز انسان کو خدا بنا کر پیش کریں اور انکے متعلق وہ باتیں لوگوں کو انکی عظمت کی سنادیں جنکی اصلیت کچھ نہ تھی لیکن کوئی پادری صاحب ہمیں یہ بتادیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو کونسی ایسی ضرورت پیش آئی تھی۔ انکا نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو وہ شخص تھا جس نے اپنی زندگی میں وہ کامیابی اور عظمت حاصل کی جسکی نظیر نہیں۔ جسکی صداقت کو اسکے سخت سے سخت مخالفوں نے آخر کار تسلیم کیا۔ جسکے سامنے بڑے بڑے سرکشوں نے آخر اپنی گردنیں جھکا دیں۔ پس اس کی عظمت تو ثابت شدہ تھی اسکو ثابت کرنیکے لیے حدیثیں بنانیکی ضرورت کیا تھی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل تو اس یقین سے بھرے ہوئے تھے کہ جس طرح کل جزیرہ نمائے عرب نے آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو تسلیم کر لیا کیونکہ انکے سامنے وہ بیّنات اور کھلے دلائل اور بڑے بڑے نشان ظاہر ہوئے جن سے وہ انکار نہ کر سکتے تھے اسی طرح

٭ یہ باتیں مَیں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ بلکہ اناجیل یہی کہتی ہیں۔ منہ

باقی دنیا بھی آپ کی صداقت تسلیم کرلے گی۔ اور جس طرح آنحضرت اپنی زندگی میں کامیاب ہوئے تھے انہی واقعات کو آپ کی موت کے بعد پیش کرنے سے صحابہؓ کو کامیابی حاصل ہوسکتی تھی۔ لہذا صحابہؓ کو کوئی ضرورت قطعاً اس بات کی نہ تھی کہ وہ آپ کی عظمت ثابت کرنیکے لیے حدیثیں بناتے۔ اور اپنے آپ کو اس وعید اور اس سزا کا مستوجب ٹھہراتے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ڈرایا تھا۔ بڑا بنانیکی کوشش تو اس کے لیے کی جانی چاہیے جو اپنی زندگی میں بڑا آدمی نہ بنا ہو جیسا کہ یسوع مسیح کی حالت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اناجیل کے بیان کے مطابق ایک ضعیف اور عاجز انسان ناکامی اور نامرادی کی حالت میں مجرموں کی طرح سزا پاکر گذر گیا اور اس لیے اس کے پیرووں کو اسے خدا بنانا پڑا۔ مگر جسکی عظمت اور بڑائی کو اس کے سخت سے سخت مخالفوں تک نے اسکی زندگی میں تسلیم کرلیا اور جس کے آگے سب سرکشوں کی گردنیں جھک گئیں اسکو بڑا بنانے کی ضرورت کیا تھی۔ اور اس سے زیادہ بڑائی اسکی کیا ہوسکتی تھی جو آپنے خود اپنی زندگی میں حاصل کرلی۔ غرضکہ جس پہلو سے میور کے دعوے کو دیکھو وہ ایک بالکل بے سروپا اور لغو اور بے اصل دعویٰ ثابت ہوتا ہے جسکی تائید سوائے میور کے اپنے خیال کے اور کسی بات سے نہیں ہوتی۔ اور یہ اس شخص کا قابل شرم جھوٹ اور افترا ہے۔

اب اس افترا پر ایک اور پہلو سے ہم نظر کرتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم وہ لوگ تھے جنہوں نے محض حق کی خاطر اور حق کو قبول کرنیکی خاطر اپنے مال اپنی جائدادیں اپنے دوست اور آخر کار اپنے گھر بھی چھوڑ دیے اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی جانیں بھی راستی اور صداقت کی خاطر ہی قربان کیں اور کسی بات کی پروا نہ کی مگر راستی کو کسی حال میں نہ چھوڑا۔ کیا ان لوگوں کے متعلق ہم یہ خیال کرسکتے ہیں کہ وہ یکدفعہ راستبازی کے اس اعلیٰ مقام سے گرکر ایسے ذلت کے گڑھے میں گر گئے تھے کہ انکی غذا ہی ہوگئی تھی کہ شب و روز جھوٹی باتیں بنا بناکر پیش کرتے تھے۔ میور صاحب کو ایسی بات پیش کرتے وقت کچھ تو شرم آنی چاہیے تھی کہ وہ لوگ جنہوں نے حق اور صداقت کی خاطر ایسی تکالیف برداشت کیں کیا وہ کبھی ایسی سیاہ کاریوں کے مرتکب ہوسکتے تھے کہ جھوٹی باتیں بنا بناکر انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کریں اور اس طرح دن رات جھوٹ بولنا اپنا پیشہ بنالیں؟ ہاں جو نقشہ انجیلیں حواریوں کا ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں اگر وہی نقشہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا قرآن کریم یا صحیح احادیث ہمارے سامنے پیش کرتیں کہ وہ ذرا سی تکلیف بھی حق کی راہ میں نہ اٹھا سکتے تھے تو بھی خیال گذر سکتا تھا کہ ممکن ہے کہ جو لوگ راستی سے اس سے بڑھکر پیار نہیں کرتے جتنا وہ اپنے مالوں اور جانوں سے پیار کرتے ہیں وہ کبھی جھوٹ کو ہی اختیار کرلیں مگر ایسا ہرگز نہیں بلکہ میور نے خود تسلیم کیا ہے کہ جس چیز کو صحابہؓ نے صداقت اور راستی سمجھا تھا۔ اس سے انہیں کوئی چیز نہ پھیر سکی حتیٰ کہ دوستوں کو چھوڑا مالوں کو چھوڑا۔ قریبیوں کو چھوڑا۔ بیٹوں نے والدین کو والدین نے بیٹوں کو چھوڑا۔ گھروں اور جائدادوں کو چھوڑا اور بالآخر اپنی زندگیاں بھی دیں

مگر حق سے نہ پھرے اور راستی سے مونہہ نہ موڑا۔ وہ لوگ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حبب الیکم الایمان و زینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر و الفسوق و العصیان ۔ وہ لوگ جو ہر قسم کی جھوٹ اور ناراستی اور فسق سے بیزار ہو چکے تھے کیا وہ یہ گندہ طریق کبھی اختیار کر سکتے تھے کہ دن رات جھوٹی حدیثیں بنا کر لوگوں میں مشہور کریں؟ کیا تاریخ سے ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ راستی کے کسقدر فدائی تھے؟۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کے سچے عاشق تھے؟ پھر اپنے معشوق اور محبوب کو چھوڑ کر وہ جھوٹ کی نجاست پر کیونکر گر سکتے تھے؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بات بھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ سے پوچھ کر کیا کرتے تھے۔ کوئی باہم تنازعہ ہو جائے تو اسکا فیصلہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کراتے تھے؟ انکے دین اور دنیا کا کوئی معاملہ نہ تھا جس میں وہ آنحضرتؐ کا فیصلہ طلب نہ کریں۔ جس خدائے قادر نے پہلے یہ فرمایا تھا فلا و ربک لایؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما اسی خدائے علیم نے انکے سینوں کو نور ایمان سے معمور دیکھکر پھر فرمایا حبب الیکم الایمان و زینہ فی قلوبکم اور رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفع الی اللہ کے بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انکا طریق زندگی نہیں بدلا۔ بلکہ پہلے اگر انکو یہ موقع تھا کہ ہر بات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ پوچھ لیتے تھے تو اب بھی وہ ہر معاملہ میں اسی تلاش میں لگے رہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ انہیں ملجائے اور اگر بعینہ انکے مطابق حال فیصلہ نہ ملے تو کوئی اس کے قریب قریب ہی معاملہ ہو جو انکے معاملہ سے مشابہ ہو جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ دیا ہو تا کہ وہ اس راہ کو ہی اختیار کریں۔ یہ روح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہر قول اور فعل میں کی جائے نہ صرف صحابہؓ میں ہی پائی جاتی ہے بلکہ وہ ورثہ ہے جو بعد کے مسلمانوں کو بھی انہی پاک لوگوں سے پہونچا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی خواہش ہی تھی جو علم حدیث کے رواج اور جمع حدیث کا باعث ہوئی پس یہ بات ایک عقلمند انسان کے وہم میں بھی نہیں گذر سکتی کہ صحابہؓ نے بجائے اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی حدیثوں کو شایع کریں اور انپر چلیں جھوٹی حدیثیں بنانی شروع کردی تھیں۔ غرضکہ یہ ایک ثابت شدہ امر ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی شخص بھی وضع حدیث کا مرتکب نہیں ہوا۔

اب اگر فرض محال کے طور پر ایک لمحہ کے لیے اس بات کو تسلیم کرلیں کہ کسی صحابی نے کوئی وضعی حدیث بنائی ہو تو ایسی حدیث کبھی مروج نہ ہو سکتی تھی جبتک کہ اس کے اس افترا میں باقی صحابہؓ بھی شامل نہ ہوتے۔ کیونکہ وہ زمانہ جسکی طرف میور احادیث کی وضع کا الزام منسوب کرتا ہے ابتدائی جنگوں کا زمانہ ہے جو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے عہد سلطنت اور حضرت عثمان کے ابتدائی ایام میں ہوئیں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اور یہی بات صاف طور پر

اس کی تحریر میں پائی جاتی ہے۔ پس میور کی دلیل کے مطابق (اگر ایسی بے سروپا باتوں اور لغو خیالات کو دلیل کا نام دے سکتے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دس پندرہ سال کے اندر اندر ہی اکثر وضعی حدیثیں مشہور ہو چکی تھیں اور یہ وہ وقت تھا جب ابھی ہزارہا صحابہؓ زندہ تھے اور وہ انکے وضعی ہونے سے بیخبر نہ ہو سکتے تھے۔ اس صورت میں گویا کل کے کل صحابہؓ وضعی حدیثوں کی شہرت دینے میں شامل تھے۔ اس سے بڑھکر افترا اور کیا ہو سکتا ہے؟

اب ہم میور کے دعوے کی اصلیت کو دیکھتے ہیں تو اس سے اسکا باطل ہونا اور بھی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے۔ دعویٰ یہ ہی کہ کثرت سے حدیثیں صحابہؓ نے جنگوں کے درمیان بنا بنا کر مشہور کیں۔ اس دعوے کی صداقت یا بطلان اسطرح پر بھی ظاہر ہو سکتا ہی کہ ہم ایک معتبر حدیث کی کتاب کو لیکر یہ دیکھیں کہ اس میں ایسی حدیثیں کسقدر ہیں جنکی روایت ان صحابہؓ تک پہنچتی ہو جو جنگوں میں بہت حصہ لینے والے تھے اور ایسی احادیث کسقدر ہیں جو ان صحابہؓ تک پہنچتی ہوں جو خود جنگوں میں شریک نہیں ہوتے تھے دونوں قسموں میں سے ہم پانچ چھ بڑے بڑے صحابہؓ کو لے لیتے ہیں اب ایک طرف تو خالد بن ولید۔ ابو عبیدہ۔ ابو سفیان۔ یزید بن ابو سفیان۔ عکرمہ۔ ضرار ابن الازور ہیں۔ اور انکے مقابل دوسری طرف ابو ہریرہ۔ انس بن مالک۔ عبداللہ بن عباس۔ خلفائے اربعہ۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ ہیں۔ اب ہم حدیث کی سب سے زیادہ معتبر کتاب کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اول الذکر صحابہؓ کی احادیث اس میں کسقدر ہیں اور موخرالذکر کی کسقدر۔ صحیح بخاری میں کل احادیث (متون موصولہ) دو ہزار چھ سو اور دو ہیں۔ اور مرفوع ایک سو انسٹھ۔ اسطرح پر کل احادیث کا مجموعہ صرف دو ہزار سات سو اکسٹھ ہوا۔ اس مجموعہ میں وہ حدیثیں نہیں گنی گئیں جو مکرر مختلف راویوں سے آئی ہیں۔ اب ان کل احادیث میں خالد بن ولید کی روایت سے کوئی حدیث نہیں۔ ایسا ہی ابو عبیدہ۔ یزید بن ابو سفیان۔ عکرمہ۔ ضرار کی روایت سے بھی کوئی حدیث نہیں اور صرف ابو سفیان کی روایت سے ایک حدیث آئی ہے۔ انکے بالمقابل جو نام بیان کیے گئے ہیں۔ انکی حدیثوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔ ابو ہریرہ ۴۴۶۔ انس بن مالک ۲۶۸ عبداللہ بن عمر ۲۷۰۔ عبداللہ بن عباس ۲۱۷۔ عائشہ صدیقہ ۲۴۲۔ دوسری عورتیں ۷۳۔ حضرت عمر ۶۰۔ حضرت علی ۲۹۔ حضرت ابوبکر ۲۲۔ حضرت عثمان ۹۔ گویا مشہور جنگ میں شامل ہونیوالے صحابہؓ کی ایک حدیث کے بالمقابل دوسرے انہی چند صحابہؓ کی احادیث کی تعداد ۱۶۴۶ ہے جو بخاری کی کل احادیث کی قریباً دو تہائی ہے۔ اب غور کرو کہ میور کا دعویٰ کسقدر افترا اور جھوٹ سے پُر ہے کیونکہ اگر اکثر حدیثیں جنگوں میں شریک ہونیوالے صحابہؓ بناتے تو چاہیے تھا کہ زیادہ تعداد انہی کی احادیث کی کتب میں پائی جاتی مگر یہاں حالت برعکس ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہی کہ جنگوں میں شریک ہونیوالے صحابہؓ کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد دوسرے صحابہؓ کی بالمقابل کچھ بھی نہیں۔ اب ان واقعات کے ہوتے ہوئے مسلمان اگر یہ نہ کہیں کہ عیسائی مصنفین کے حملے محض عناد کی وجہ سے ہوتے ہیں اور اسلام پر سراسر افترا ہوتے ہیں تو اور

کیا کہیں۔ الغرض باوجود ان صریح جھوٹے اور مفتریانہ دعووں کے یہ لوگ مغرب میں اسلامی علوم کے بڑے محقق سمجھے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ پر افترا کا الزام ایک شرمناک افترا ہے۔ اور اسکی کوئی شہادت اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ جبتک صحابہ رضی اللہ عنہم زندہ رہے اسوقت تک کوئی وضعی حدیث اسلام میں نہیں آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ احادیث کا وضع ہونا صحابہؓ بلکہ تابعین کے زمانہ کے بھی بعد شروع ہوا اور مسلمان محققین نے اس خطرہ کو محسوس کر کے جلدی اسکا تدارک شروع کر دیا۔ پہلی صدی ہجری کے اخیر تک کوئی اس قسم کی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وضع احادیث اسوقت شروع ہو چکا تھا۔ بلکہ اس امر کی تاریخی شہادتیں ملتی ہیں کہ اسوقت تک اسلامی دنیا میں وضعی احادیث کا نام و نشان نہ پایا جاتا تھا چنانچہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے متعلق جو پہلی صدی ہجری کے اخیر میں خلیفہ ہوئے یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہے کتب عمر بن عبد العزیز الی ابی بکر بن حزم انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء ولا تقبل الا حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولیفشوا العلم ولیجلسوا حتی یعلم من لا یعلم فان العلم لا یھلك حتی یکون سرا۔ یعنی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ابی بکر بن حزم کو لکھا (ابوبکر بن حزم آپ کے ماتحت حاکم مدینہ تھے اور خود تابعی تھے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث ملے اسے نگہ رکھو اور اسے لکھ لو۔ مَیں ڈرتا ہوں کہ علم (یعنی علم حدیث) گم نہ ہو جائے اور علماء سب اُٹھ نہ جاویں اور سوائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے اور کچھ قبول نہ کرو۔ اور چاہیئے کہ علم کو پھیلایا جاوے اور علمی مجالس ہوا کریں تاکہ جو لوگ (حدیث سے) ناواقف ہیں ان کو تعلیم دیجاوے کیونکہ علم نابود نہیں ہوتا جبتک کہ وہ مخفی نہ ہو جاوے۔ ابونعیم نے اپنی تاریخ اصبہان میں لکھا ہے کہ یہ حکم صرف حاکم مدینہ کے نام ہی نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ تمام صوبوں کے حاکموں کے نام یہی حکم خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے بھیجا تھا۔ خواہ یہ حکم ایک حاکم کے نام بھیجا گیا ہو یا سب کے۔ مَیں جو استدلال اس سے کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسوقت تک جب خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ حکم لکھا جو تاریخی طور پر ثابت ہے مسلمانوں کے درمیان وضعی احادیث پیدا نہ ہوئی تھیں اور یہ بات اس حکم کے الفاظ پر غور کرنے سے ثابت ہوتی ہے۔ امیرالمومنین نے جس بات کا اندیشہ ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے کہ علماء مرتے جاتے ہیں ایسا نہ ہو کہ علم حدیث گم ہو جائے اس لئے تم تمام حدیثوں کو جو تمہیں ملیں لکھ لو۔ اور وضعی احادیث کا نام تک بھی نہیں لیا۔ اگر وضعی احادیث اسوقت پیدا ہو گئی ہوتیں تو بڑا خطرہ یہ نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ علماء مر جائیں گے تو علم حدیث گم ہو جائیگا بلکہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وضعی احادیث بکثرت مروج ہو گئی ہیں اور صحیح احادیث کو ان سے الگ کرنا ضروری ہے۔ مگر اس حکم میں وضعی احادیث کا نام تک بھی نہیں پایا جاتا جس سے

صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت وضعی احادیث کا وجود بھی نہ تھا جس بات کا خطرہ بار بار ظاہر کیا ہے وہ یہی ہے کہ علم مخفی ہوکر نابود نہ ہو جائے اور اسی غرض کے لیے نہ صرف یہ حکم دیا کہ حدیث لکھ لی جائے بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ علمی تذکرے بڑھائے جاویں اور علمی مجالس منعقد کیجاویں تا ناواقف لوگ بھی احادیث سے واقف ہو جاویں۔ اور یہ جو کہا کہ آنحضرت کی حدیث کے سوائے اور کچھ قبول نہ کیا جاوے اس کا مطلب صرف اسیقدر ہے کہ اور مثلاً کسی صحابی کا قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے خلط نہ کر دیا جاوے۔ بہرحال وضعی احادیث کا اس تحریر میں ذکر تک بھی نہیں چہ جائیکہ انکی کثرت یا انکے مروج ہونیکا ذکر ہو۔ بہت سے اور واقعات تاریخ میں پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کسی حدیث کے قبول کرنے یا اسکو آگے بیان کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ بلکہ ایک ایک حدیث کے متعلق صحیح علم حاصل کرنیکی خاطر سیکڑوں میلوں کے سفر اختیار کرتے اور ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے۔ جابر بن عبداللہ کا تذکرہ صحیح بخاری میں موجود ہے کہ ایک حدیث کی خاطر انہوں نے مدینہ سے شام کا سفر کیا۔ دیکھو باب الخروج فی طلب العلم۔ جہاں لکھا ہے۔ رحل جابر بن عبد اللہ مسیرۃ شہر الی عبد اللہ بن انیس فی حدیث واحد۔ یعنی جابر بن عبداللہ نے ایک مہینہ کا سفر عبداللہ بن انیس کی طرف صرف ایک حدیث کی خاطر کیا۔ جسکا تذکرہ جابر کے اپنے الفاظ میں یوں موجود ہے۔ بلغنی عن رجل حدیث سمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاشتریت بعیرا ثم شددت رحلی فسرت الیہ شہرا حتی قدمت الشام فاذا عبد اللہ بن انیس۔ فقلت للبواب قل لہ جابر علی الباب فقال ابن عبد اللہ قلت نعم فخرج فاعتنقنی فقلت حدیث بلغنی عنک انک سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخشیت ان اموت قبل ان اسمعہ۔ ایسا ہی ابو ایوب انصاری کے متعلق یہ روایت ہے کہ اس نے عقبہ بن عامر کی طرف ایک حدیث کے سننے کے لیے لمبا سفر کیا۔ ایسا ہی ایک اور صحابی کا ذکر ہے کہ اس نے فضالہ بن عبید کو ملنے کے لیے مصر کا سفر کیا کیونکہ وہ ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کرتے تھے یہ تھا صحابہؓ کا جوش اور عشق آنحضرتؐ کی حدیث کی تلاش میں کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے جو کچھ سفر کی صعوبتیں تھیں وہ انکی نظر میں ایک حدیث کے سننے کے بالمقابل ہیچ تھیں۔ اگر وضعی احادیث کا اُس زمانہ میں کوئی ذخیرہ تھا جسے صحابہؓ نے قبول کر لیا تھا تو ایک ایک حدیث کی خاطر ایسے لمبے سفر اختیار کرنیکے کیا معنے تھے۔ یہی حال تابعین کا معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابوالعالیہ کی روایت سے خطیب نے بیان کیا ہے کہ کنا نسمع عن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا نرضی حتی خرجنا الیھم فسمعنا منھم یعنی ہم آنحضرتؐ کے صحابیوں کی روایت سے ایک حدیث کو سنتے تھے مگر ہم صبر نہ کرتے تھے جبتک سفر کرکے خود ان

صحابیوں کے مونہہ سے اس حدیث کو نہ سن لیں۔ اس قسم کے کئی واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ جن سب کا بیان کرنا موجب طوالت ہوگا۔

احادیث کے قابل اعتبار ہونے پر بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ ابتدا میں تحریر میں نہیں لائی گئیں بلکہ زبانی سلسلہ روایت سے ہی محدثین تک پہنچی ہیں۔ میور کہتا ہے کہ یہ کسی صورت میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ عرب اپنے حافظہ پر ایسا ہی بھروسہ کر سکتے تھے جیسا تحریر پر۔ اور پھر لکھتا ہے کہ نہ صرف حافظہ پورے طور پر حدیث کو محفوظ ہی نہیں رکھ سکتا تھا بلکہ زبانی روایت کے سلسلہ میں غلطیوں اور مبالغہ کی آمیزش بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اب اول تو یہ کہنا کسی صورت میں صحیح نہیں ہے کہ پہلی صدی ہجری کے آخیر تک حدیث کا کوئی حصہ بھی لکھا نہیں گیا۔ ایسی روایات بکثرت موجود ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی بعض لوگ حدیث کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ابوہریرۃؓ کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عمرو حدیث لکھا کرتے تھے۔ حضرت علی کے پاس بھی لکھی ہوئی حدیث کا موجود ہونا ثابت ہے۔ فتح مکہ والے سال میں خزاعہ نے بنی لیث کا ایک آدمی بطور کسی گذشتہ خون کے قصاص کے مار ڈالا۔ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ پڑھا۔ اور جب آپ تمام کر چکے تو اہل یمن میں سے ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ مجھے یہ خطبہ لکھوا دیجئے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے لکھدیا جاوے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرتؐ نے خطبہ پڑھا تو لوگوں نے اسے اپنے حافظوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ ورنہ بعد میں لکھا کیونکر جاتا۔ یہ تمام روایتیں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ اور ان سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہی بعض صحابہ حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے۔ اور ایسا ہی یہ بھی شہادت ملتی ہے کہ لکھنے کا رواج آپ کے بعد اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ یہ بات میور کو بھی تسلیم کرنی پڑی ہے کیونکہ ایک موقع پر وہ لکھتا ہے کہ اگر ان باتوں کو جو پیش کیجاتی ہیں تسلیم بھی کر لیا جاوے تو ان سے اس سے بڑھکر اور کوئی بات ثابت نہیں ہوتی کہ بعض صحابہؓ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تحریری یادداشتیں تھیں۔ مگر وہ لکھتا ہے کہ جو کتب احادیث اسوقت موجود ہیں ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کونسی احادیث کسی محدث نے تحریری یادداشت سے لی تھیں اور کونسی صرف زبانی روایت کے سلسلے سے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی طریق درست ہے۔ کیونکہ اگر کسی حدیث کے متعلق سلسلہ روایت کو چھوڑ کر صرف اسیقدر پر اکتفا کیا جاتا کہ یہ حدیث کسی پرانی یادداشت سے لی گئی ہے تو اول تو تحقیق کا دروازہ بند ہو جاتا کیونکہ سلسلۂ رواۃ کے معلوم ہونے پر تو حدیث پر جرح بھی ہو سکتی ہے لیکن صرف ایک پرانی یادداشت کا حوالہ دینے سے آئندہ نسلوں کو یہ کیونکر معلوم ہو سکتا کہ وہ یادداشت کیسی تھی یا کس شخص کی لکھی ہوئی تھی۔ پس ایسی حدیثیں بالکل پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتیں۔ اور یہ بات صاف ہے کہ ایسی یادداشتوں کا اول تو محفوظ رکھنا آسان امر نہ تھا اور پھر بڑی مشکل یہ پڑتی کہ یہ کیونکر معلوم ہوتا کہ فلاں یادداشت واقعی فلاں

صحابی کی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے یا بعد میں کسی نے جعل بنالیا ہے۔ کیونکہ زبانی سلسلہ میں تو ہر ایک راوی کا نام ظاہر کرنا پڑتا ہے اور ایک ایک لفظ تنقید کے نیچے آسکتا ہے مگر تحریری یادداشتوں میں ایک ایسے زمانہ میں جب چھاپہ خانہ کا رواج نہیں تھا اور اس لیے عام طور پر کوئی تحریر مشتہر نہ ہوسکتی تھی کہ سب لوگ یقین کرلیں کہ فلاں بات کے لکھنے والا واقعی فلاں شخص ہے۔ ایسے زمانہ اور ان حالات میں اگر تحریری یادداشتوں سے حدیثیں جمع کی جاتیں تو وہ ایسی مشتبہ ہوجاتیں کہ بالکل قابل اعتبار نہ رہتیں۔ علاوہ ازیں محدثین خود کب اس بات پر مطمئن ہوسکتے تھے کہ ایک یادداشت انکے ہاتھ لگ گئی ہے کیونکہ اس میں وہ خود اپنی تنقید سے کام نہ لے سکتے تھے۔ بلکہ لازماً سلسلہ رواۃ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ جبتک راویوں کے ذریعہ سے کوئی حدیث کسی صحابی تک نہ پہنچ جائے اسوقت تک وہ قطعاً اس کے متعلق مطمئن نہ ہوسکتے تھے تحریری یادداشتیں اصل میں ابتدا میں بھی حافظہ کو تازہ کرنیکے لیے تھیں اور محدثین نے بھی انسے یہی کام لیا یعنی انکو بطور تائیدی شہادت قبول کیا اور اس لیے ان کے ذکر کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔

مگر معترض کہتا ہے کہ اگر تحریری یادداشتیں رکھی بھی گئیں تو صرف چند حدیثوں کی رکھی گئیں اور عام طور پر حدیث لکھنے کا رواج ابتدائی زمانہ میں نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی احادیث کے لکھنے سے روکا۔ اور آپ کا اس ممانعت سے یہی مطلب تھا کہ عام طور پر حدیث کو نہ لکھا جاوے جسکی وجہ یہ تھی کہ چونکہ قرآن کریم جیسے جیسے نازل ہوتا تھا لکھا جاتا تھا۔ اور اسکا لکھنا ضروری تھا اس لیے اس اندیشہ سے کہ مبادا حدیث کی عام طور پر لکھا جانے سے قرآن شریف اور حدیث خلط ملط نہو جائیں آپنے حدیث کے لکھنے کی ممانعت کی اور جہاں ایسا اندیشہ نہیں تھا وہاں لکھنے کی اجازت بھی دی کیونکہ آپ کی اجازت سے حدیثوں کا لکھا جانا بھی ثابت ہے۔ عام طور پر حدیث کے لکھے جانے میں ایک اور خطرہ بھی تھا اور وہ یہ کہ اگر حدیث کے لکھنے کا رواج ہوجاتا تو حدیث کو زبانی یاد رکھنے کی ضرورت بالکل مفقود ہوجاتی۔ اور اسطرح پر زبانی روایت کا سلسلہ قطعاً موقوف ہوکر صرف یادداشتوں پر حدیث کی بنا رہ جاتی جس میں جعل کی گنجایش بہت زیادہ ہوتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن کے لکھنے میں یہ دقت کیوں پیش نہ آئی تو اسکا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم اور حدیث کا مقابلہ اس پہلو پر نہیں ہوسکتا۔ قرآن شریف کی ہر ایک آیت سیکڑوں آدمی اسکے نازل ہوتے ہی حفظ کرلیتے تھے اور اسکا تحریر میں لانا حفاظت کیلیے ایک زاید سامان تھا۔ علاوہ ازیں قرآن شریف عام طور پر نمازوں میں پڑھا جاتا تھا اور اسکی کوئی آیت چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ اسکے لیے ابتدا سے ہی یہ سامان تھا کہ الگ الگ سورتیں تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آیت کے نازل ہوتے ہی فرمادیا کرتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورۃ میں فلاں مقام پر رکھی جاوے۔ لیکن حدیث کو یہ باتیں حاصل نہ تھیں۔ بعض احادیث (اس میں شک نہیں) ایسی تھیں کہ تمام مسلمانوں کیلیے انکا جاننا ضروری تھا مثلاً احکام نماز۔ زکوٰۃ وغیرہ۔ مگر بہت سی

حدیثیں ایسی تھیں کہ وہ کل صحابہؓ کے علم میں نہ آسکتی تھیں۔ ایک شخص ایک وقت آیا اور اس نے کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی۔ وہ بات اپنے وقت پر ہوگئی اور کسی صحابی نے جو اسوقت موجود تھا اس کو یاد رکھ لیا۔ مگر قرآن کریم کی آیات کی طرح احادیث کا عام طور پر اعلان نہ ہوتا تھا۔ یعنی آیت جب نازل ہوتی تو اسکو لکھ بھی لیا جاتا اور عام طور پر اسکا اعلان بھی ہوجاتا۔ حافظ لوگ اسکو مطابق ہدایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسکی جگہ پر رکھکر یاد بھی کر لیتے اور عام طور پر مسلمانوں میں اسکا چرچا ہوجاتا۔ خالی لکھنا کافی نہ تھا اور نہ ہی خالی لکھ لینا حدیث کے لیے کافی ہوتا بلکہ مشکلات اور بھی بڑھ جاتے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کے جمع کرنیکی وجہ یہ تھی کہ حافظہ پر اعتبار نہ تھا یہ بالکل غلط ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب جمع کے لیے اولاً حضرت ابوبکرؓ کو تحریک کی تو وجہ یہ بیان کی کہ بہت سے حافظان قرآن یمامہ کی لڑائی میں شہید ہوگئے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ قرآن کریم کے لکھے ہوئے اجزا کو ایک جگہ جمع کیا جاوے تا ایسا نہ ہو کہ تمام حافظوں کی موت سے قرآن کریم کا کوئی حصہ مشتبہ ہوجاوے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حافظہ پر اعتبار تو تھا مگر ڈر یہ تھا کہ جن لوگوں نے کل قرآن کریم کو حفظ کیا ہوا ہے وہ جنگوں میں شہید ہوکر سب کے سب دنیا سے اُٹھ نہ جاویں۔ غرضکہ قرآن کریم کی حفاظت کے لیے علاوہ تحریر کے اور بہت سے سامان موجود تھے جو حدیث کو میسر نہ آسکتے تھے اس لیے اسکی حفاظت کا طریق صرف حافظہ کو ہی قرار دیا گیا جبتک کہ وہ وقت نہ آگیا کہ حدیث کا علم کافی طور پر پھیل کر اس قابل ہوگیا کہ اسے کتابوں میں جمع کر دیا جاوے۔ اسقدر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث کی ایسی حفاظت نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی جیسی قرآن کریم کی ہوئی مگر تاہم تاریخی شہادت حدیث کی حفاظت کی بھی کافی موجود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حافظہ پر اسقدر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا جسقدر تحریر پر۔ یہ قول اس زمانہ کے لیے تو بیشک درست ہے لیکن ابتدائی زمانہ میں بالخصوص عرب میں حافظہ نے جو حیرت انگیز کارروائیاں دکھائی ہیں وہ آج کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتیں۔ اگر عرب میں حافظہ ایسا ہی ناقابل اعتبار ہوتا جیساکہ میور کہتا ہے تو آج نہ عرب کی جاہلیت اور ابتدائی اسلامی زمانہ کے اشعار ہی ہم تک پہنچتے اور نہ ہی لغت اور نحو کے علوم کی ان باریک باتوں تک ہم پہنچ سکتے جنسے آج ہم فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ عربی اشعار بعینہٖ اسی طرح کے سلسلہ رواۃ سے ہم تک پہنچے ہیں جسطرح احادیث۔ اور اصل بات یہ ہے کہ یہی ایک طریق اس زمانہ میں کسی علم کی حفاظت کا تھا۔ اشعار کے راوی نہ صرف کثرت سے شعر ہی زبانی سلسلہ روایت سے بیان کر سکتے تھے بلکہ وہ شاعروں کے نام اور انکے حالات سے بھی واقف ہوتے تھے۔ اور انکے شعروں میں جو حوالے ہوتے تھے انسے بھی خوب آگاہ تھے۔ شعروں کے مشہور راویوں میں سے ایک اصمعی ہیں جنہوں نے اپنے متعلق لکھا ہے کہ قبل بلوغت کو پہنچنے کے مَیں نے بارہ ہزار شعر حفظ کر لیے تھے (عقد الفرید) کیا ان لوگوں کے لیے جن میں ایسے حافظے والے لوگ موجود تھے

چند ہزار حدیث کا یاد رکھ لینا کوئی مشکل امر تھا؟ ابو ضمضم کے متعلق اصمعی نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک موقعہ پر چند نوجوان بعد عشاء کے اس کے پاس پہنچے اور بیان کیا کہ ہم تم سے کچھ باتیں سننا چاہتے ہیں۔ اس نے انکو ایک سو شاعروں کے شعر سنائے جن سب کا نام عمر تھا۔ شعبی کہتا ہے کہ میں نے شعر سے کمتر روایت کسی علم میں نہیں کی اور شعر میں میری روایت اسقدر ہے کہ اگر میں چاہوں تو برابر ایک مہینہ تک شعر پڑھتا چلا جاؤں اور کوئی شعر دوبارہ نہ آئیگا۔ پس اگر اسقدر اشعار جنکی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے محض زبانی سلسلہ رواۃ سے اسلام سے بھی پہلے زمانے سے ہم تک پہونچ گئے تو میں نہیں سمجھتا کہ حدیث کے اس سلسلہ سے پہنچنے میں مخالفین کو کونسی دقتیں نظر آتی ہیں۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ شعر کا سلسلہ روایت یونہی کوئی لغو کام تھا بلکہ لغت اور نحو کی بنا انہی اشعار پر ہے جو زبانی روایتوں سے پہنچے ہیں۔ ہر زمانہ میں جب کبھی کسی لفظ کے معنوں یا کسی نحو کے قاعدہ میں تنازعہ پیدا ہوا ہے تو شعر کی سند سے اسکا آخری فیصلہ ہوتا رہا ہے اور کسی نے آج تک یہ اعتراض نہیں کیا کہ یہ شعر تو زبانی روایت سے مدت تک چلا آیا تھا اور بہت دیر بعد تحریر میں آیا اسکا اعتبار کچھ نہیں۔ پس تعجب ہے کہ جس صورت میں نازک ترین مسائل لغت یا نحو صرف زبانی یادداشتوں کی بنا پر حل کیے جا سکتے ہیں تو حدیث کے لیے اتنا شور کیوں مچایا جاتا ہے کہ زبانی روایتوں کے ہونیکی وجہ سے اسپر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ صحابہؓ میں کثرت سے ایسے لوگ تھے جن کو پرانے شعر یاد تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کو بھی کئی ہزار شعر جاہلیت کے یاد تھے تو کیا تین سو حدیث وہ یاد نہ رکھ سکتی تھیں۔ ابن عباسؓ کے متعلق یہ واقعہ دیوان عمر ابن ابی ربیعہ کے شروع میں لکھا ہے کہ جب عمر چند شعر بنا کر انکے پاس مشورہ کے لیے لایا کہ آیا یہ شایع کرنیکے قابل ہیں یا نہیں تو آپنے صرف ایک ہی دفعہ اس سے سنکر دوبارہ سب کے سب خود سنا دیئے یہ قریباً ستر شعر تھے اسپر بعض حاضرین نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ شعر آپکو پہلے معلوم تھے تو آپنے انکے تعجب پر تعجب کر کے جواب دیا۔ اویسمع احد شیئًا ولا یحفظہ۔ یعنی کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی ایک بات کو سنے اور پھر اسے یاد نہ رکھے۔ کیا ایسے انسان کے لیے اڑھائی سو حدیث کا یاد رکھنا کوئی مشکل امر تھا؟ غرضکہ یہ کہنا کہ حدیث اس لیے قابل اعتبار نہیں کہ ایک سو سال تک صرف حافظہ پر ہی اسکا انحصار رہا یا تو اعلیٰ درجہ کی جہالت ہے اور یا پرلے درجہ کی حماقت۔

یہ امر کہ جس چیز کا انحصار حافظہ پر ہو اس میں غلطی اور مبالغہ کا اندیشہ ہے حدیث کو پایۂ اعتبار سے گرا نہیں سکتا کیونکہ اگر حافظہ کا یہ حال ہے تو تحریر کہاں اس سے خالی ہے۔ اس زمانے میں بھی جبکہ ادنیٰ تکلیف سے صحیح واقعات معلوم ہو سکتے ہیں ہزارہا ایسی غلط باتیں شایع ہوتی رہتی ہیں جن کو سنکر ہنسی آتی ہے مثلاً ۴۔ اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ کے متعلق جس سے دھرم سالہ اور کانگڑہ تباہ ہوئے بعض انگریزی اخباروں نے

یہ لکھا کہ کانگڑہ جو بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے زلزلہ سے تباہ ہوگیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اخباروں کو صحت اور غلطی کی چنداں پروا نہیں ہوتی تو ایسی ہی غلطیاں ہم دوسری تحریروں سے نکالکر دکھا دیں گے۔ ہیزل کا اینوئل جو ایک مشہور اور مستند کتاب ہر قسم کے حوالجات کے لیے سمجھی جاتی ہے اس میں اسی زلزلہ کا ذکر لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک سخت زلزلہ نے ایک وسیع ضلع میں جو آگرہ اور شملہ کے درمیان واقع ہے عام تباہی اور سخت نقصان کیا۔ اور پھر لکھا ہے کہ خاص دھرم سالہ میں پانچسو آدمی مرے۔ پھر ایک شخص نے بڑے بڑے زلزلوں کا حال ایک جگہ لکھتے ہوئے اسی زلزلے کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے کئی سو آدمی ہلاک ہوئے۔ حالانکہ گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق بیس ہزار سے کم آدمی ہلاک نہیں ہوئے۔ یہ مَیں نے صرف ایک واقعہ کے متعلق چند غلطیوں کا ذکر کیا ہے تا معلوم ہو کہ تحریر اور پھر اس زمانہ کی تحریر کہاں تک غلطیوں کی آمیزش سے پاک ہے۔ باقی رہیں پُرانی لکھی ہوئی یادداشتیں جو اتفاقاً ہاتھ لگ جائیں انپر ایسا اعتبار کر لینا کہ گویا انکا لفظ لفظ صداقت سے بھرا ہوا ہے یہ بھی ایک سخت غلطی ہے۔ بلکہ جہاں زبانی سلسلہ رواۃ میں ہر طرح سے جرح اور تنقید ہو سکتی ہے ایسی تحریریں بالکل کسی تنقید کے ماتحت نہیں آسکتیں اور اس لیے پایۂ اعتبار سے گری ہوئی سمجھنی چاہییں۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ احادیث کا زبانی یاد رکھنا کوئی ایسا کام نہ تھا جسکے وہ لوگ عادی نہ ہوں بلکہ ان کے لیے یہ ایک معمولی سی بات تھی۔ اسی لیے تحریری یادداشتیں اگر موجود بھی تھیں تو محدثین نے معتبر روایت کو ہی مانا ہے اور تحریر کی تائید بھی جب تک روایت سے نہ ہو یا کم از کم تحریر کے متعلق روایت نہ ہو اسے کوئی وقعت نہیں دی۔ امام بخاری کو چھ لاکھ حدیث یاد تھی اور انہوں نے ایک کو بھی لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ کئی لوگ اپنی لکھی ہوئی حدیثوں کا آپکے حافظہ سے مقابلہ کر کے اپنی تحریری یادداشتوں کو درست کیا کرتے تھے۔

ان تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی گئیں یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث میں جھوٹ کی ملاوٹ صحابہؓ کے وقت تک یعنی پہلی صدی ہجری کے اختتام تک ہرگز نہیں ہوئی۔ بلکہ جب صحابہؓ کل اس دنیا سے گذر گئے اور اکثر تابعین بھی انتقال کر چکے تو اسوقت جھوٹی حدیثوں کا بننا شروع ہوا۔ مگر اس خطرہ کو فی الفور علماء نے محسوس کر کے جمع حدیث کا کام شروع کر دیا جس پر میں انشاءاللہ الگ ایک مضمون لکھوں گا کیونکہ یہ مضمون کسیقدر تفصیلی بحث چاہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی حل کرنیکے قابل ہے کہ حدیث کی کتابوں کی اسقدر کثرت کے ساتھ اور مختلف فرقوں میں احادیث کے اسقدر اختلافات کے ساتھ کونسی وہ احادیث ہیں جن پر ہم اعتبار کر سکتے ہیں۔

بقیہ اعتراضات وطن

(سلسلہ کے لیے دیکھو نمبر۸ جلد ۵ صفحہ ۳۱۸)

اور الہام الٰہی اے ورڈ اینڈ ٹو گرلس پر یہ اعتراض کہ "یہ کیسے معلوم ہوا کہ مقرر پُرزور اور پُرجوش الفاظ میں تقریر کر رہا ہے؟ الفاظ کیسے ذہن میں محفوظ ہے۔ گورے انگریز اہل زبان اور کالے ہندوستانی محمد علی کی تقریر ایک جیسی کیسے ہو سکتی ہے" پرلے درجہ کے لغو اعتراض ہیں۔ کیا اس امر کو کہ کوئی شخص پُرجوش الفاظ میں تقریر کر رہا ہے ہر شخص نہیں سمجھ سکتا خواہ وہ زبان سننے والا سمجھتا ہو یا نہ۔ اور پھر چند الفاظ کے محفوظ رہنے پر تعجب ظاہر کرنا بھی محض حماقت ہے۔ باقی رہا تقریر کا ایک جیسے ہونا سو یہ تو خواب کا معاملہ ہے۔ میں تعجب کرتا ہوں کہ وطن کو یہ اعتراض قرآن کریم پر کیوں پیدا نہ ہوا کہ سورج اور چاند اور ستاروں نے سجدہ کیونکر کیا تھا۔ یا یہ کہ سات سوکھی دُبلی گائیاں سات فربہ گائیوں کو کیونکر کھائے جا رہی تھیں۔ کیا یہ اعتراض ایک ہی قسم کے ہیں یا نہیں؟ مَیں اس مضمون کو کسیقدر بسط کے ساتھ لکھنا چاہتا تھا مگر چونکہ گنجایش باقی نہیں رہی اس لیے ایک دو باتیں اختصار کے ساتھ بیان کر کے اس کو ختم کرتا ہوں۔ مضمون زیر بحث میں دو اعتراض ایسے کیے گئے ہیں جنپر معترض کو بہت فخر ہے کہ یہ ٹوٹ نہیں سکتے۔ اور انکو بار بار دوہرا کر اعتراض کیے ہیں۔ اول یہ کہ حضرت مرزا صاحب کے الہام اے ورڈ اینڈ ٹو گرلس میں الہامی ترجمہ یہ ہے ایک کلام اور دو لڑکیاں۔ حالانکہ ورڈ کا ترجمہ کلام نہیں بلکہ کلمہ ہے اور کلمہ لفظ مفرد کو کہتے ہیں۔ اور پھر اس غلطی کی اصلاح انسانی ہاتھوں سے یوں کی گئی کہ دوسرے موقع پر ترجمہ کرتے وقت ورڈ کا ترجمہ کلمہ لکھا۔ یہ خلاصہ ہے اعتراض کا۔ یہ اعتراض سرتاپا لغو ہے۔ اول یہ کہ جس جگہ ورڈ کا ترجمہ کلام کیا گیا ہے وہ تو لکھنے والے نے ترجمہ کر دیا ہے نہ حضرت مسیح موعودؑ نے خود وہ ترجمہ کیا ہے اور نہ ہی الہاماً وہ ترجما انکو معلوم ہوا۔ بلکہ وہاں تو لکھنے والے نے الہام الٰہی اور ترجمہ کے درمیان لفظ ترجمہ بڑھا کر صاف ظاہر کر دیا ہے کہ یہ ترجمہ خود اس نے کیا ہے۔ باقی رہا یہ کہ ورڈ کا ترجمہ کلام درست نہیں۔ معلوم نہیں اسقدر انگریزی دانی کا دعویٰ لکھنے والے نے کس بنا پر کیا ہے۔ اور پھر اس دعویٰ میں اسقدر غلو کیا ہے کہ ترجمہ کنندہ کی اس خیالی غلطی پر بار بار استہزا کیا ہے۔ اگر معترض نے بائبل ہی پڑھ لی ہوتی تو ایسی حماقت کا ارتکاب وہ نہ کرتا۔ یوحنا کی کتاب شروع اس سے ہوتی ہے۔ "ابتدا میں کلام تھا" اور "کلام" ترجمہ ہے ورڈ کا۔ پھر کوئی ڈکشنری ہی دیکھ لی ہوتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ ورڈ لفظ مفرد کو ہی نہیں کہتے بلکہ ورڈ کے معنے کلام الٰہی کے بھی ہیں۔ کیا انگریزی ڈکشنریوں میں اور کیا انگریزی اردو ڈکشنریوں میں۔ پھر کلمہ کا انحصار لفظ مفرد پر کرنا یہ بھی ناواقفیت ہے، یا معترض نے بغیر تحقیق کے ایک سنی سنائی بات لکھدی ہے

افسوس کہ یہ لوگ قرآن کریم پر بھی غور نہیں کرتے۔ سورہ مومنون کا آخری رکوع دیکھو۔ رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت اس کل عبارت کو فرمایا انھا کلمة ھو قائلھا ط ایسا ہی کبرت کلمة تخرج من افواھم اور پھر کلمات ربی سے مراد کیا خدا کے بولے ہوئے مفرد الفاظ ہیں۔ شاید معترض کو اتنا پتہ بھی نہیں کہ مسلمان کلمہ طیبہ کسے کہتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت مسیح موعودؑ کے الہام ورؤیا میں کلمہ سے مراد یہی ہے کہ اس لڑکے کے متعلق پیشگوئی اللہ تعالیٰ نے کی ہے انہی معنوں کے لحاظ سے وہ ورڈ اور کلمہ اور کلام کہلایا۔

دوسرا اعتراض جس پر بہت زور دیا گیا ہے یہ ہے کہ جب دو لڑکیاں پہلے موجود ہیں تو اب لڑکی ہونے سے الہام الٰہی ٹو گرلس والا غلط ہو گیا اس کے متعلق خود مولوی انشاء اللہ صاحب نے بھی اپنے نامہ نگار نقاش کی تائید کی ہے۔ سو یاد رہے کہ یہ ایک پیشگوئی ہے جیسا لڑکا آئندہ پیدا ہونیوالا تھا ویسا ہی الہام میں جن دو لڑکیوں کا ذکر ہے وہ بھی آئندہ پیدا ہونیوالی ہیں اور یہ کل پیشگوئی آئندہ کے متعلق ہے اگر پہلے ٹو گرلس سے دو موجود لڑکیاں سمجھ لی گئیں تو یہ ایک اجتہادی غلطی ہے۔ اور یہ الہام سارا آئندہ کے متعلق ہے

ان تمام باتوں پر غور کر کے ایک طالب حق اس نتیجہ تک پہنچیگا کہ جیسا ایک مرد صادق کی شہادت سے حضرت مسیح موعودؑ کے منجانب اللہ ہونے پر گواہی ملتی ہے ایسا ہی ایک مکذب کے استہزا سے بھی یہ شہادت ملتی ہے کہ یہ شخص مامور من اللہ ہے۔ کیونکہ جو اعتراض پہلوں پر کیے گئے وہی اس پر کیے جاتے ہیں۔ اور کوئی اعتراض ایسا نہیں جس کی زد دیگر انبیاء علیہم السلام پر نہ پڑتی ہو۔

مذہب کے اہم اصول

ولایت کے ایک سالہ ہبرٹ جرنل میں سر آلور لاج[٭] نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں یہ تجویز کی گئی ہے کہ پرانے عیسائی عقائد نامہ کی بجائے ایک نیا عقائد نامہ تیار کیا جاوے جس میں موجودہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق عقائد درج کیے جاویں۔ راقم مضمون کہتا ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ جب ہمارے دوسرے حالات مرور زمانہ سے بدلتے رہتے ہیں تو عقائد کو کیوں نہ بدلا جاوے۔ اس نئے عقائد نامہ کے عقائد میں خدا کی ہستی کا اقرار سب سے پہلا اصل مذہب ہے۔ راقم مضمون لکھتا ہے کہ "انسان سے برتر ہستیوں (جس سے مراد اسکی ملائکہ وغیرہ معلوم ہوتی ہے) اور ایک سب سے

٭ سر آلور لاج ولایت کے ایک مشہور سائنس دان ہیں۔ اور علم کیمیا کے بڑے ماہر ہیں۔ منہ

برتر ہستی کا وجود ہر ایک مذہب کا اہم اور ابتدائی اصل ہے اور یہ خیال کرنا کہ انسان ہی سب سے برتر ہستی ہو ممکن ہے میرے نزدیک علوم حقہ کا انکار ہے‘‘۔ اس بنا پر پہلا نیا عقیدہ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ’’میں ایک غیر محدود اور ابدی ہستی پر ایمان لاتا ہوں جو ہمارا ہدایت کرنیوالا اور محبت کرنیوالا باپ ہے اور جس سے تمام چیزیں ہیں‘‘۔ ایسا ہی اس نئے عقیدہ میں اصول دعا کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

اس مضمون کو پڑھکر مذہب اسلام کی صداقت اور عظمت کا ایک نیا اثر دل پر ہوتا ہے کہ اس پاک مذہب نے وہ اصول قائم کیے ہیں جنکو بدلنے کی کسی زمانہ میں بھی ضرورت نہیں۔ بلکہ جب سے دنیا پیدا ہوئی اور تاریخ انسانی کا پتہ چلتا ہے وہ اصول انسان کی فطرت میں مرکوز پائے جاتے ہیں اور آجتک کسی مذہب نے انکا انکار نہیں کیا میرے نزدیک مذہب کے اہم اصول صرف دو ہیں یعنی ایک ہستی باری تعالیٰ اور دوسرے بعثت انبیاء یعنی خدائے واحد کا اپنے خاص بندوں کے ذریعے دنیا پر اپنی مرضی ظاہر کرنا۔ یہ دو اصول ایسے ہیں کہ انسے کسی مذہب نے انکار نہیں کیا اور یہ اسلام کی صداقت پر ایک عظیم الشان شہادت ہے۔ اول ہستی باری تعالیٰ کو لو۔ اور جہانتک تاریخ انسانی کا پتہ ملتا ہے تلاش کرو یہی معلوم ہوگا کہ تمام قوموں نے ہر زمانہ میں ایک اعلیٰ اور برتر ہستی کا اقرار کیا ہے خواہ کتنی ہی غلطیوں کی آمیزش اس اقرار کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ بلکہ جن لوگوں نے بتوں یا عناصر یا دیگر اشیاء میں خدائی قوتوں کا ہونا مانا ہے انکی بھی فطرت دراصل ایک اعلیٰ ہستی کی تلاش میں لگی ہوئی ہے گو بہ سبب کسی قسم کی تاریکیوں میں مبتلا ہونیکے وہ اصل حقیقت کو نہیں پہنچ سکے مگر پھر بھی انکی طبیعت اس بات پر کبھی قانع نہیں ہوئی کہ انسان سے برتر کوئی ہستی نہیں بلکہ وہ اس برتر ہستی کی تلاش میں ہی ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ بہرحال جہانتک تاریخ پتہ دیتی ہے تمام مذاہب کو دیکھو ان میں ہستی باری تعالیٰ کا اقرار ضرور پایا جائیگا۔ عیسائی یسوع کو خدا مانکر۔ ہندو کرشن یا رامچندر کو خدا مانکر۔ ایک بت پرست بت کو خدا مانکر۔ آتش پرست آتش کو خدا مانکر پھر بھی اس بات پر قانع نہیں ہوئے کہ یہی خدا ہیں بلکہ باوجود ان غلطیوں کے سچے خدا کی ہستی کا اقرار کیا اور ان خداؤں سے برتر ایک خدا کو مانا۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک خدا کی ہستی کا اقرار فطرت انسانی میں مرکوز ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان تمام مذاہب میں جو مختلف زمانوں میں مختلف ممالک میں پیدا ہوئے یا مروج رہے باوجود سب قسم کے اختلافوں کے اس ایک بات پر ہمیشہ سے اتفاق رہتا۔ یہ کوئی بناوٹی بات نہیں ہوسکتی بلکہ جس صانع نے فطرت انسانی کو بنایا ہے اسی نے اس فطرت میں اپنے ہاتھ سے یہ نقش بھی کر دیا ہے کہ وہ اس صانع کا اقرار کرے یہانتک کہ دہریہ بھی ایک سبب اول کو مانتا ہے۔

اب یہ سوال ہوگا کہ اگر ہستی باری تعالیٰ کا اقرار کم و بیش کل مذاہب میں پایا جاتا ہے تو اسلام کو کیا خصوصیت ہوئی؟ اسلام کو بیشک ایک خصوصیت حاصل ہے اور یہ خصوصیت ہی اس بات پر شاہد ہے کہ مذہب اسلام

ہی وہ مذہب ہے جو فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ ہستی باری تعالیٰ کا اقرار سوائے اسلام کے ہر ایک مذہب میں کسی نہ کسی قسم کی غلطیوں سے ملا ہوا ہے۔ غلطیاں میں انہیں اس لیے کہتا ہوں کہ وہ خود خصوصیات قومی ہیں اور فطرت انسانی کے مطابق نہیں ہیں۔ مثلاً ایک شخص ہستی باری تعالیٰ کا اقرار کرتے ہوئے یہ تجویز کرتا ہے کہ ایک خدا کا بیٹا بھی ہے جو اصل میں خدا ہی ہے۔ اور یہ خدا یسوع مسیح ہے۔ اب اگر خدا تعالیٰ کی خدائی کے علاوہ یسوع کی خدائی کا اقرار بھی ایک امر حق ہوتا جسکی ضرورت ہر ایک انسان کے لیے تھی تو چاہیئے تھا کہ جسطرح خدا کی ہستی کا اقرار تمام دلوں میں منقش ہے اور فطرت انسانی نے ابتدائے تاریخ انسان سے اسپر گواہی دی ہے اسی طرح یسوع کی خدائی کا اقرار بھی فطرت انسانی میں پایا جاتا مگر برعکس اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ محض ایک خصوصیت قومی ہے جو صرف اُنیس سو ۱۹۰۰ برس سے پیدا ہوئی۔ نہ اسکا نشان اسوقت سے پہلے دنیا میں تھا نہ اسکے بعد کسی مذہب میں سوائے اسی ایک خاص قوم کے پایا جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص کرشن کو خدا کہتا ہے وہ بھی ایک خصوصیت قومی اور ملکی ہے یا جو شخص بُتوں میں خدائی صفات کا ہونا مانتا ہے وہ بھی ایک خصوصیت قومی ہے اسطرح پر سوائے اسلام کے تمام مذاہب نے علاوہ اُس پاک اور برتر ہستی کے جسکا نقش فطرت انسانی میں ہے ایک ایک قومی خدا قرار دے لیا ہے اور صرف اسلام نے ہی اُس خدا کو دنیا میں پیش کیا ہے جس پر فطرت انسانی شاہد ہے۔ اور اسی لیے اسلام ہی وہ مذہب ہے جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں مانا جاسکتا ہے اور قومی خدا یا قومی دیوتے مثل یسوع مسیح کے ایک وقت کے لیے ایک خاص قوم کے درمیان مانے گئے ہیں جنکو عام فطرت انسانی نے قبول نہیں کیا۔ اور اسلام کا عقیدہ ہی اللہ تعالیٰ کی ہستی کے متعلق وہ عقیدہ ہے جسکو مرور زمانہ کے تقاضے بدلنے کی ضرورت نہیں بلکہ جب سے دنیا ہوئی اور جب تک رہیگی اور جب تک فطرت انسانی نہیں بدلتی یہ عقیدہ بھی نہیں بدل سکتا۔ اس سے بڑھکر اور کونسی بات اسلام کی صداقت پر شاہد ہوسکتی ہے۔

دوسرا بنیادی مسئلہ مذہب کا بعثت انبیاء ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی دنیا پر اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ اس مسئلہ کو بھی تمام دنیا کے مذاہب نے مانا ہوا ہے مگر جسطرح اللہ تعالیٰ کی ہستی کے مسئلہ میں صداقت کے ساتھ بہت سی غلطیاں ملادی ہیں اسی طرح اس مسئلہ میں بھی سوائے اسلام کے غلطیوں کی آمیزش کردیگئی ہے۔ مثلاً ہندو مذہب بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ خدا اپنا کلام نازل کرتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اسکے یہ بھی کہتا ہے کہ خدا کا کلام صرف ایک ہی دفعہ ہندوستان کے چار رشیوں پر نازل ہوا تھا اس کے بعد کلام الٰہی کسی شخص پر نازل نہیں ہوسکتا۔ یہودی بھی کلام الٰہی کے خدا کے برگزیدہ بندوں پر نازل ہونیکو مانتے ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ صرف بنی اسرائیل پر ہی کلام الٰہی نازل ہوا اور اس قوم کے سوائے دوسری سب قومیں اس سے محروم ہیں۔ عیسائیوں کا اعتقاد بھی یہودیوں کی طرح ہی ہے مگر ان کے نزدیک مسیح کے حواریوں کے ساتھ کلام الٰہی کا سلسلہ بند ہوگیا۔ ایسا ہی دوسرے مذاہب میں کلام الٰہی کے نازل

ہونیکو تسلیم کیا گیا ہے مگر یہ عقیدہ ہر جگہ کسی نہ کسی غلطی کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اب اگر ان تمام مذاہب میں سے قدر مشترک لیا جاوے تو صحیح عقیدہ جو مشترک طور پر تمام مذاہب میں پایا جاتا ہے یہ ثابت ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سُنت قدیمہ ہے کہ وہ اپنے برگزیدہ بندوں پر اپنا کلام نازل کرتا ہے۔ سو یہی صحیح عقیدہ مذہب اسلام نے لیا ہے اور تمام غلطیوں کو اس سے دور کر کے اصل عقیدہ کو قائم رکھا ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اپنے برگزیدہ بندوں پر اپنا کلام نازل فرماتا رہا ہے اور ہمیشہ تک وہ اپنی اس سُنت کو جاری رکھے گا۔

پس یہ دو عقیدے جو ہر ایک مذہب کے اہم اصول ہیں جن پر مذہب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ صرف اسلام میں ہی ایسی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ کہ ہر ایک قسم کی غلطی کی آمیزش سے پاک ہیں۔ اور جو کچھ تمام مذاہب دنیا میں قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے وہی اسلام نے صحیح رکھا ہے اور تمام قومی خصوصیات اور قومی دیوتاؤں کو دور کر کے وہ عقائد پیش کیے ہیں جنکو کسی زمانہ یا کسی ملک میں بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

بنگالیوں کی دلجوئی

اس رسالہ کے ماہ فروری ۱۹۰۶ء کے نمبر میں یہ پیشگوئی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بنگالہ کی نسبت شایع کی گئی ہے۔ جو بعینہٖ ان الفاظ میں ہے۔ ''پہلے بنگالہ کی نسبت جو کچھ حکم جاری کیا گیا تھا اب انکی دلجوئی ہوگی''، ان لوگوں کے لیے جو حضرت مسیح موعودؑ کی پیشگوئیوں پر محض عناد کی وجہ سے یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ آپ کی پیشگوئیوں میں کسی امر کی تعیین نہیں ہوتی بلکہ مبہم اور گول مول ہوتی ہیں غور کا مقام ہے کہ انہی ایام میں اللہ تعالیٰ نے ایسے کھلے کھلے نشان ظاہر کر دیے ہیں کہ مخالفین کا مونہہ بند ہو گیا ہے چراغدین کی موت کا الہام کیسی صفائی سے پورا ہوا۔ ڈوئی کی تباہی کا الہام جسکی پیشگوئی امریکہ اور انگلستان میں مشتہر ہو چکی تھی اور وہاں اخباروں میں درج ہو چکی تھی کسقدر واضح طور سے پورا ہوا۔ اور ایسا ہی اور بہت سے نشانات ظاہر ہوئے ہیں لیکن اگر مخالفین کی تحریروں کو دیکھو تو وہی ایک آتھم والی پیشگوئی کو بار بار پیش کرتے ہیں اور ان پیشگوئیوں کے متعلق جو نہایت صفائی سے پوری ہو رہی ہیں کبھی کچھ نہیں لکھتے اگر آتھم کی پیشگوئی پر کوئی اعتراض واقعی انکے دلوں میں نیک نیتی سے ایسا پیدا ہوا ہے جسکو وہ منہاج نبوت کی رو سے واقعی اعتراض سمجھتے ہیں تو ایمانداری کا کم از کم یہ تو تقاضا ہونا چاہیئے کہ آتھم کی پیشگوئی پر اعتراض کرتے وقت یہ بھی لکھ دیا کریں کہ فلاں فلاں پیشگوئی صفائی سے پوری ہوئی اور یا کم از کم یہ کہ انپر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ مگر بات یہ ہے کہ آتھم کی پیشگوئی پر اعتراض محض شرارت کی وجہ سے ہے اور یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ یہ قدیم سے سُنت الٰہیہ ہے کہ انذاری پیشگوئیاں ٹل بھی جایا کرتی ہیں پس

جس صورت میں پیشگوئی میں صاف شرط موجود ہے اور آتھم کا شرط سے فائدہ اُٹھانا ایک ثابت شدہ امر ہے اور پھر وہ مطابق پیشگوئی کے ہلاک بھی ہوگیا تو اس پیشگوئی پر بار بار اعتراض کرنا جحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم ظلما وعلوا[۳۱] والا معاملہ نہیں تو اور کیا ہے۔

اب بنگالہ کی نسبت جو پیشگوئی آج سے چھ سات ماہ پہلے شایع کی گئی تھی اسپر غور کرو۔ کہ کس صفائی سے پوری ہوئی۔ پیشگوئی کے شایع ہونیکے وقت بنگالیوں کی شورش اور فساد حد درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور اُدھر سر فلر کی گورنمنٹ اس بات پر تلی ہوئی تھی کہ اس تمام فساد کو زور سے دبایا جاوے۔ ایسے وقت میں دو قسم کی امیدیں تھیں لوگوں کے دلوں میں ضرور تھیں یعنی بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ شاید گورنمنٹ بنگالیوں کی شورش وغیرہ سے دب کر تقسیم بنگال کو منسوخ کردیگی۔ چنانچہ بعض نجومیوں نے ایسی پیشگوئیاں اپنی جنتریوں میں شایع بھی کردی تھیں۔ دوسری طرف جو لوگ اس امر سے واقف تھے کہ سر فلر کیسا مستعد اور کسی سے نہ دبنے والا حاکم ہے۔ انکا یہ خیال تھا کہ گورنمنٹ اس تمام شورش کی کوئی پروا نہیں کریگی اور قانون کے منشاء کے مطابق اس شورش کو مناسب ذرائع عمل میں لاکر فرو کریگی۔ لیکن ان دو خیالوں کے سوا اور کوئی خیال اُسوقت کسی نے ظاہر نہیں کیا۔ انہیں حالات کے نیچے ۱۱۔ فروری سنہ ۱۹۰۶ء کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر پاکر حضرت مسیح موعودؑ نے اس امر کا اعلان کیا کہ اس حکم کے متعلق جو ہوچکا ہے اب گورنمنٹ صرف ایسا طریق اختیار کریگی جس سے بنگالیوں کی دلجوئی ہو۔ جسکا یہ صاف صاف مفہوم ہے کہ جو خیال لوگوں کے دلوں میں ہیں وہ دونوں پورے نہیں ہونگے بلکہ ایک ایسا طریق اختیار کیا جاوے گا جس سے تقسیم بھی منسوخ نہ ہو اور اہل بنگال کی دلجوئی بھی ہو جائے۔ اب جسوقت تک نئے صوبہ کی حکومت سر فلر کے ہاتھ میں تھی اسوقت تک کسی بات سے بنگالیوں کی دلجوئی کا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ کیونکہ ایک طرف تو سر فلر بھی ایک زبردست حاکم تھا اور دوسری طرف بنگالیوں کو اس سے اسکی بعض کارروائیوں کے سبب سے خاص عناد تھا۔ اور بظاہر پانچ سال تک جبتک سر فلر کا زمانہ حکومت خود بخود ختم ہوجاتا گورنمنٹ کی پالسی بنگالیونکی نسبت بدل نہیں سکتی تھی۔ مگر وہ علیم خدا جس نے اپنے بندہ پر پیش از وقت یہ ظاہر کیا تھا کہ اب بنگالیوں کی دلجوئی ہوگی وہ خوب جانتا تھا کہ کسطرح پر واقعات پیدا ہونیوالے ہیں جنسے دلجوئی کی جاوے گی۔ چنانچہ یک بیک جب کسی کو خیال بھی نہ تھا سر فلر نے استعفا پیش کیا اور گورنمنٹ نے اسے منظور کیا۔ یہ بات کہ اس استعفا سے بنگالیوں کی دلجوئی ہوئی ایسی صاف ہے کہ ایک سخت سے سخت دشمن بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا جو خوشیاں بنگالہ میں سر فلر کے استعفا پر ہوئی ہیں اور جسطرح پر بنگالی اخباروں نے خوشی کے نعرے بلند کیے ہیں اور کالموں کے کالم اسی خوشی میں سیاہ کیے ہیں اس سے بہت کم لوگ ناواقف ہونگے۔ اور یہ سب باتیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ بنگالیوں نے گورنمنٹ کی اس دلجوئی کو خوب محسوس کیا ہے۔ خود سر فلر کے استعفا کی منظوری اس دلجوئی پر ایک اور

بڑی شہادتیں ہیں۔ وہ واقعات جن کے سبب سے سابق لفٹنٹ گورنر کو استعفا دینا پڑا یہ ہیں کہ بنگالیوں کی گذشتہ شورش میں دو مدرسوں کے طالب علموں نے مدرسین کے اُکسانے سے ایسے فعل کیے جن سے پبلک کے امن میں خلل ڈالا گیا۔ منتظمین مدرسہ کو جب طالب علموں کی ان شرارتوں کی طرف توجہ دلائی گئی تو انہوں نے انہیں سزا دینے سے انکار کیا اس پر لفٹنٹ گورنر نے یونیورسٹی کو یہ لکھا کہ ان دونوں مدرسوں کا تعلق یونیورسٹی سے قطع کر دیا جاوے ابھی اس تحریر پر سینیٹ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ گورنمنٹ ہند نے سر فلر کو لکھا کہ وہ اپنی تحریر کو واپس لیں۔ سر فلر نے انکار کیا اور استعفا پیش کیا جسکو گورنمنٹ ہند نے منظور کیا۔ اب ظاہر ہے کہ اس استعفا کے منظور کرنے میں گورنمنٹ ہند نے بنگالیوں کی حد درجہ کی دلجوئی کی ہے اور دو مدرسوں کی خاطر ایک لفٹنٹ گورنر کا استعفا منظور کیا پس سر بی فلر کا بنگال سے چلے جانا بنگالیوں کی دلجوئی والی پیشگوئی کو صاف طور پر پورا کرتا ہے۔

اس سے بھی بڑھکر ایک اور امر اس دلجوئی پر شاہد ہے اور وہ ہے نئے لفٹنٹ گورنر مسٹر ہیر کا تقرر۔ اگر فلر صاحب کی بجائے کوئی ایسا لفٹنٹ گورنر مقرر کیا جاتا جس کے ساتھ بنگالیوں کو ایسی ہی پرخاش ہوتی جیسی فلر سے تھی تو اس تغیر سے دلجوئی کا مقصد پورے طور پر حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ مگر چونکہ گورنمنٹ ہند کا اصل مقصد بنگالیوں کی دلجوئی کرنیکا تھا اور نہ سر فلر سے گورنمنٹ کو کوئی ناراضگی نہ تھی اسلیے اسکا جانشین انتخاب کرنے میں گورنمنٹ نے نہایت دانائی سے کام لیا ہے اور ایک ایسے آدمی کو منتخب کیا ہے جسپر بنگالیوں اور گورنمنٹ دونوں کو اعتبار ہے کہ وہ دلجوئی کی پالسی اختیار کریگا۔ بلکہ ایک انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۲۴۔ اگست ۱۹۰۶ء میں یہ خط لکھا ہے کہ "اس میں شک نہیں کہ سر بی فلر کے جانشین کو یہ حکم ملا ہے اور اس نے اس حکم کو قبول کیا ہے کہ وہ مفسدہ پرداز بابوؤں کی دلجوئی کرے" "خواہ گورنمنٹ کی طرف سے کوئی ایسا حکم ملا ہو یا نہ" اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ یہ سارا تغیر محض بنگالیوں کی دلجوئی کے لیے ہے اور خود بنگالی اخبارات بھی اس بات پر مطمئن ہیں چنانچہ اخبار امرتا بازار پتر کا جو بنگالیوں کا سب سے مشہور اخبار ہے اور جو گورنمنٹ کی کسی بات پر مطمئن نہیں ہوتا اس بات کو تسلیم کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ "یہ اغلب ہے کہ فلر کا جانشین ایک بالکل دلجوئی کی پالسی اختیار کریگا"

اب ان تمام واقعات پر غور کرو کہ کیا خدائے علیم کے سوائے کوئی اور ان باتوں کو قبل از وقت بتا سکتا تھا؟ اور وہ بھی ایسے وقت جبکہ گورنمنٹ رعایا پر اور رعایا گورنمنٹ پر حد درجہ کی بدظن ہو رہی تھی۔ اور دلجوئی کا نام و نشان نہ تھا نہ ہی کسی دانشمند نے جو ملکی امور سے واقف ہو اُس وقت یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اب گورنمنٹ بنگالیوں کی دلجوئی کریگی میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اُس وقت کسی کو یہ خیال بھی نہ تھا۔ اور یہ امور سب بعد میں ہی وقوع میں آئے ہیں ہاں خدائے علیم ان باتوں کو جانتا تھا اور اُس نے بطور نشان ان باتوں کو اپنے بندے پر ظاہر کیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کبھی ان ملکی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی اور نہ ہی انکو ان باتوں کا پتہ ہوتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ بلکہ

جس دن یہ الہام الٰہی ہوا تو نہایت حیرت سے فرماتے تھے کہ مجھے تو کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس طرف توجہ نہیں ہوئی خدا نے خود ہی اس امر کو ظاہر فرمایا ہے۔ کہاں ہیں وہ دانا دل! جو دنیا کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتیجے نکالتے ہیں ان باتوں پر وہ کیوں غور نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ہستی کا اور اپنے علم و قدرت کا کھلا کھلا ثبوت ان نشانات کے ذریعہ دے رہا ہے مگر افسوس ان لوگوں پر اور اس زمانہ پر کہ وہ مطلق اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ ایسا ہی ہوتا آیا ہے نبیوں کی سُنت پوری ہو جیسا انکے وقت میں باوجود کھلے کھلے نشانوں کے دنیا کے لوگوں نے قبول حق سے انکار کیا۔ اسی طرح اب بھی کر رہے ہیں ورنہ یہ کوئی معمولی نشان نہیں جو دکھائے جا رہے ہیں بلکہ ایک ایک نشان اللہ تعالیٰ کی ہستی پر کھلا کھلا گواہ ہے جس پر کسی قسم کی جرح نہیں ہو سکتی۔ قوم کی اصلاح کا دعویٰ کرنیوالے تو بہت ہیں مگر قوم کو ان باتوں کی طرف توجہ کرنے سے روکا جاتا ہے جو انکے اللہ تعالیٰ پر ازدیاد ایمان کا موجب ہیں۔ افسوس!۔

آریہ سماج کی موت

سچے اور جھوٹے مذہب میں اللہ تعالیٰ نے ایک کھلا کھلا امتیاز رکھا ہے۔ سچے مذہب سے مراد میری وہ مذہب یا سلسلہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے مامور کو بھیجکر دنیا میں قائم کرتا ہے اور جھوٹے مذہب سے مراد ایسا سلسلہ ہے جو زمینی لوگ اپنی کوششوں سے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس سلسلہ کو اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ سے قائم کرتا ہے وہ قوانین قدرت کے مطابق ابتدا میں ایک بیج کی طرح ہوتا ہے اور بتدریج ترقی کرتا اور نشو و نما پاتا ہے۔ اور ابتدا میں دنیا کے لوگ اس نازک پودہ کو دیکھکر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جلد نیست و نابود ہو جائیگا مگر چونکہ خدا تعالیٰ کی نصرت اور تائید اسکے ساتھ ہوتی ہے وہ کسی کی کوششوں سے نابود نہیں ہو سکتا بلکہ دن بدن ترقی کرتا اور آخر کار ایک نہایت مضبوط اور قد آور درخت بنجاتا ہے جسکا سایہ مشرق و مغرب میں پھیل جاتا ہے۔ جھوٹے مذہب کا شور ابتدا میں زیادہ ہوتا ہے مگر چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں۔ اس لیے روز بروز تنزل کی حالت کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں دو کھلی کھلی نظیریں اسکی ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ یعنی ایک طرف سلسلہ احمدیہ اور دوسری طرف آریہ سماج۔ سلسلہ احمدیہ کے بانی کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے مامور ہو کر آیا ہے اور خدا اسکا ناصر ہے اور اسے غالب کریگا۔ چنانچہ آج سے پچیس سال پہلے کی اسکی پیشگوئیاں کتاب براہین احمدیہ میں موجود ہیں جو ایسے وقت میں شایع کی گئیں جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ساتھ ایک بھی آدمی نہ تھا اور نہ اس سلسلہ کا کوئی نام و نشان ہی تھا۔ ان پیشگوئیوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدے فرمائے ہیں کہ وہ اس سلسلہ کو دنیا کے کل مذاہب پر غالب کریگا اور اسکے بانی کی زندگی میں ہی

دور دور سے لوگ اس کے پاس آئیں گے اور بڑی بڑی جماعتیں اس سلسلہ میں داخل ہوتی چلی جاویں گی۔ ان پیشگوئیوں کو ہم اپنی آنکھوں سے پورا ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ اور کوئی شخص نہیں جو اس بات کا کچھ بھی جواب دے سکے۔ کہ اگر یہ سلسلہ منجانب اللہ نہیں تو یہ غیب کی باتیں اور یہ اقتداری پیشگوئیاں جو انسان کے حیطۂ علم اور قدرت میں ہرگز نہیں کیوں سچی ثابت ہو رہی ہیں۔ مگر اس جگہ ان پیشگوئیوں کا ذکر کرنا میرا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ایک اور پیشگوئی کی طرف میں ناظرین کو توجہ دلانی چاہتا ہوں جس کے پورا ہونے کے آثار ابھی سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ کوئی تین سال کا عرصہ گذرتا ہے کہ تذکرۃ الشہادتین میں اپنی جماعت کو چند نصیحتیں کرتے وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ لکھا تھا۔

"اے تمام لوگو! سن رکھو کہ یہ اس کی پیشگوئی ہے جس نے زمین و آسمان بنایا وہ اپنی اس جماعت کو تمام ملکوں میں پھیلا دیگا اور حجت اور برہان کی رو سے سب پر انکو غلبہ بخشیگا۔ وہ دن آتے ہیں بلکہ قریب ہیں کہ دنیا میں صرف یہی ایک مذہب ہوگا جو عزت کے ساتھ یاد کیا جائیگا۔ خدا اس مذہب اور اس سلسلہ میں نہایت درجہ اور فوق العادت برکت ڈالیگا۔ اور ہر ایک کو جو اسکے معدوم کرنیکا فکر رکھتا ہے نامراد رکھیگا اور یہ غلبہ ہمیشہ رہیگا یہانتک کہ قیامت آجائیگی ...... اور ابھی تیسری صدی آج کے دن سے پوری نہیں ہوگی کہ عیسیٰؑ کے انتظار کرنیوالے کیا مسلمان اور کیا عیسائی سخت نومید اور بدظن ہو کر اس جھوٹے عقیدہ کو چھوڑینگے۔ اور دنیا میں ایک ہی مذہب ہوگا اور ایک ہی پیشوا۔ میں تو ایک تخم ریزی کرنے آیا ہوں سو میرے ہاتھ سے وہ تخم بویا گیا اور اب وہ بڑھے گا اور پھولیگا اور کوئی نہیں جو اسکو روک سکے۔"

اس پیشگوئی کے بالمقابل دوسری طرف ایک پیشگوئی آپ کی آریہ سماج کے متعلق ہے۔ جو ان الفاظ میں اسی جگہ دی گئی ہے۔

"اور یہ خیال مت کرو! کہ آریہ یعنی ہندو دیانندی مذہب والے کچھ چیز ہیں وہ صرف اس زنبور کی طرح ہیں جس میں بجز نیش زنی کے اور کچھ نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ توحید کیا چیز ہے اور روحانیت سے سراسر بے نصیب ہیں۔ عیب چینی کرنا اور خدا کے پاک رسولوں کو گالیاں دینا انکا کام ہے اور بڑا کمال انکا یہی ہے کہ شیطانی وساوس سے اعتراضات کے ذخیرے جمع کر رہے ہیں۔ اور تقویٰ اور طہارت کی روح ان میں نہیں یاد رکھو! کہ بغیر روحانیت کے کوئی مذہب چل نہیں سکتا اور مذہب بغیر روحانیت کے کچھ بھی چیز نہیں۔ جس مذہب میں روحانیت نہیں اور جس مذہب میں خدا کے ساتھ مکالمہ کا تعلق نہیں اور صدق و صفا کی روح نہیں اور آسمانی کشش اسکے ساتھ نہیں۔ اور فوق العادت تبدیلی کا نمونہ اسکے پاس نہیں۔ وہ مذہب مردہ ہے اس سے مت ڈرو۔ ابھی تم میں سے لاکھوں اور کروڑوں انسان زندہ ہوں گے۔ کہ اس مذہب کو نابود ہوتے دیکھ لوگے۔ کیونکہ یہ مذہب آریہ کا زمین سے ہے نہ آسمان سے۔ اور زمین کی باتیں پیش کرتا ہے نہ آسمان کی۔"

پس جیسا ایک طرف سلسلہ احمدیہ کی ترقی اور غلبہ کی پیشگوئی ہے دوسری طرف آریہ سماج کی موت کی پیشگوئی

ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ اگرچہ اس موت کے آثار کھلے کھلے نظر آرہے ہیں مگر آریہ سماجی انکو اس رنگ میں پیش کرنیسے قبول نہ کرتے لیکن اب انکے اپنے ایک وکیل نے آریہ سماج کی حالت تنزل اور مردگی کو قبول کرلیا ہے۔ یعنی نو آریہ دھرم پال نے اپنے رسالہ اندر میں ایک مبسوط مضمون آریہ سماج کی زندگی یا موت پر لکھکر آریہ سماج کی موت کو تسلیم کیا ہے۔ اور آریہ اخباروں نے بھی اس مضمون کی تائید کی ہے۔ اصل بات جو اس مضمون کی محرک ہوئی وہ صرف اسقدر معلوم ہوتی ہے کہ دھرم پال صاحب کو آریہ سماجی اپنے گھروں میں داخل نہیں ہونے دیتے اور دھرم پال صاحب اسبات پر مصر ہیں کہ انہیں وہی حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو جنم کے ہندوؤں کو حاصل ہیں اور مردوں کے علاوہ انکا عورتوں سے بھی میل جول ہو۔ خیر یہ تو انکا باہمی جھگڑا ہے جسطرح چاہیں اسے نبٹیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا آریہ سماجیوں کے چند مرتدین کو اپنے گھروں میں داخل کر لینے سے آریہ سماج کی موت کیحالت زندگی سے بدل سکتی ہے؟ اس مضمون میں مذہب کی طاقت کے دو پہلو بیان کیے گئے ہیں ایک ڈسٹرکشن یا گرانا دوسرا کنسٹرکشن یا بنانا۔ بہت زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ڈسٹرکشن میں آریہ سماج نے بڑی طاقت دکھائی ہے۔ جسکا ماحصل یہ ہے کہ دوسرے مذاہب پر اعتراض کرنے میں آریہ سماج بہت کامیاب ہوا ہے۔ لیکن اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو دہریے آریہ سماج سے بھی زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔ اور دھرم پال صاحب کا یہ دعویٰ کہ ”آریہ سماج نے اس ملٹری یا کھنڈن کے پہلو میں اسقدر ترقی کی ہے کہ اسکا ثانی مذہبی دنیا کی تواریخ میں آجتک کوئی ہوا ہے شاید آئندہ بھی کوئی نہ ہو“ پرلے درجہ کی حماقت کا دعویٰ ہے۔ آریہ سماج نے کیا کیا ہے اسلام پر اعتراض کیے ہیں تو صرف پادریوں کا پس خوردہ کھایا ہے۔ عیسائیت پر اعتراض کیے ہیں تو دہریوں کی نقل کی ہے۔ بلکہ دہریوں نے جو اعتراض کیے ہیں آریہ سماج انکے برابر کبھی نہیں پہنچ سکتا ہاں چونکہ آریہ اور دہریہ کو آپس میں یہ مناسبت ہے کہ دہریہ تو سرے سے خدا کا منکر ہے اور آریہ خدا کی خالقیت کا منکر ہے اور یہ کہتا ہے کہ جوڑنے جاڑنے کے لیے خدا درکار ہے جو درحقیقت اصل خدا کا انکار ہی ہے اس لیے دہریوں کی طرح اس مذہب نے بھی اپنا کام صرف یہی رکھا ہوا ہے کہ دوسرے مذاہب پر اعتراض کرے پاک اور مقدس لوگوں کو گالیاں نکالے اور اپنے گھر سے اگر کچھ بات پیش کی ہے تو وہ صرف نیوگ کا گند ہے چنانچہ دھرم پال صاحب نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ آریہ سماج دوسرے مذاہب پر حملے کرنے میں بہت ہشیار مگر کنسٹرکشن یعنی خود اصلاح کا کوئی پہلو پیش کرنے میں بالکل نامراد رہا ہے۔ پس جب آریہ سماج خود کوئی اصلاح پیش نہیں کر سکتا تو اس کے دوسرے مذاہب پر حملے بھی محض ایک گندے جوش کا نتیجہ ہیں نہ پاکیزگی کی محبت کا نتیجہ۔ اگر آریہ صاحبان کے دلوں میں کوئی روحانیت کوئی پاکیزگی کی محبت یا کوئی ذرہ بھی خدا کی راہ میں انکساری ہوتی تو بجائے پاک لوگوں کو گالیاں دینے کے کچھ اپنی خوبیاں پیش کرتے مگر اس خانہ میں یعنی آریہ سماج کی اصلاح کے خانہ میں دھرم پال صاحب خود اقراری ہیں کہ ایک ”بڑا بھاری گول صفر لگ رہا ہے جو زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ میں آریہ سماج کی موت کا پیغام لیکر آیا ہوں“ پھر لکھا ہے کہ ”جب ہم آریہ سماج میں اس سول ڈیپارٹمنٹ یا کنسٹرکشن

یا اندرونی زندگی کی طرف نگاہ مارتے ہیں تو ہمیں اسقدر سخت مایوسی ہوتی ہے کہ جسکا بیان ہم لفظوں میں نہیں کر سکتے۔ اور بعض لوگوں کا یہ خیال کہ آریہ سماج مر گیا ہے یا جلدی ہی مر جائیگا ہمیں سخت شش و پنج میں ڈالدیتا ہے۔" پس اصل کام مذہب کا جو اصلاح کا کام ہے اگر وہی کسی مذہب نے کر کے نہیں دکھایا تو محض اعتراض گن کر کامیابی کی امید رکھنا عبث ہے۔ ایک جاہل سے جاہل آدمی عمدہ سے عمدہ کام پر اعتراض کر کے خوش ہو سکتا ہے خواہ اسکے اعتراض محض اسکی اپنی جہالت کی وجہ سے ہی ہوں۔ یہی حال آریہ سماج کا ہے کہ وہ اس بات پر نازاں ہے کہ اس نے مقدسوں کو خوب سیر ہو کر گالیاں دے لی ہیں۔ مگر ایسے اعتراضات تو افسوس اور رونیکا مقام ہے نہ خوشی اور فخر کا۔ ایساہی ایک بیباک اور شریر آدمی ایک بھلے مانس کی پگڑی اتار سکتا ہے مگر کیا اس سے یہ ثابت ہو گا کہ اس نے ایک بڑا کام کر دکھایا؟ بلکہ یہی کہا جائیگا کہ اس نے ایک شرارت کا کام کیا ہے۔ جہاں تک میں نے آریہ سماج کے حملوں کو جو وہ دوسرے مذاہب پر کرتے ہیں دیکھا ہے اُس جاہل کے اعتراضات یا اُس بیباک کی گستاخی اور شرارت سے بڑھکر انکی کوئی وقعت نہیں۔ بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک آریہ سماج کی یہی حالت ہے۔ لیکھرام کی تحریریں دیکھ لو خود دھرم پال صاحب کی تحریریں دیکھ لو۔ انکی مثال وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کی۔ مثلاً یہ کہنا کہ مسلمانوں کا خدا بھنگڑ ہے۔ اور طرح طرح سے استہزا کرنا ایک نیک مباحثہ کرنیوالے کے موزون حال باتیں نہیں بلکہ ایک نقال یا مسخرے کو موزون ہیں۔ یا ایک بیباک اور گستاخ انسان کو جسے نہ خدا سے تعلق ہے نہ مذہب سے۔ بلکہ صرف بھلے مانسوں کی عزت اتارنے کا وتیرہ اس نے اختیار کیا ہوا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آخر جو مذہب سچا ہے اسے بھی تو دوسروں پر اعتراض کرنے ہی پڑیں گے کیونکہ اصلاح کا کام سوائے اسکے ہو ہی نہیں سکتا کہ دوسرے مذاہب کی غلطیاں دکھائی جاویں تو میں کہتا ہوں کہ اس سے مجھے بھی انکار نہیں۔ مگر جو مذہب دوسروں کی غلطیاں دکھاتا ہے اسے کوئی اپنی خوبی بھی تو دکھانی چاہیئے۔ جس صورت میں آریہ سماج اس کے وکیلوں کے اپنے اقرار کے مطابق اندرونی خوبی کوئی نہیں رکھتا اور اصلاح یا کنسٹرکشن کا کام اس نے خود کوئی کر کے نہیں دکھایا تو پاک لوگوں پر حملے کرنا وہی بیباکانہ اور گستاخانہ شیوہ ہے جسکی مثال اوپر دیگئی۔ جو شخص نیک نیتی سے حملہ کرتا ہے اسے پہلے یہ تو دکھانا چاہیئے کہ میرے اندر یہ خوبی یا یہ قوت ہے۔ لیکن ایک مذہب کے اندر کوئی اندرونی خوبی نہیں تو پھر دوسروں پر حملے کرنے صرف ایک اوباشانہ طریق ہے۔ جتنے اللہ تعالیٰ کے برگزیدے گذرے ہیں انہوں نے کبھی یہ طریق اختیار نہیں کیا کہ آپ کوئی کمال حاصل کرنیکے بغیر دوسروں کی نکتہ چینی شروع کر دیں۔ اسی لیے خدا کا پاک کلام مسلمانوں کو یہی تعلیم دیتا ہے کہ علیکم انفسکم یعنی مقدم یہ بات ہے کہ تم اپنے نفسوں کو پاک کرو اور جب تم خود پاکیزگی حاصل کر لو تو پھر دوسروں کی طرف توجہ کرو۔ خدا کے کل مقدس نبیوں نے اور کل راستبازوں نے جہاں کہیں وہ پیدا ہوئے یہی طریق اختیار کیا مگر یہ طریق جو آریہ سماج نے اختیار کیا ہے کسی ملک کے کسی نیک آدمی نے اختیار نہیں کیا۔ یہ لوگ اپنے نفسوں کی اصلاح کی طرف کچھ توجہ نہیں کرتے بلکہ پاکوں اور نیکوں کو گالیاں نکالنے میں ہی اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی آریہ سماج کی طاقت کی نشانی نہیں بلکہ اسکے اندر ایک اور گند کے ہونیکی نشانی ہے۔

اس مضمون کے چند اور مقامات سے اقتباس خالی از فائدہ نہ ہونگے۔ ایک جگہ راقم مضمون یہ سوال پوچھتا ہے کہ "آریہ سماج کیوں ترقی نہیں کرتا یا کیوں دن بدن نیچے کو جا رہا ہے"۔ اس تنزل کے طرح طرح کے اسباب پیش کیے گئے ہیں مگر اصل وجہ اسکی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اسکے شامل حال نہیں اور نہ ہی اس مذہب میں روحانیت کا نام و نشان ہے۔ ظاہر طور پر جو کامیابی آریہ سماج کی معلوم ہوتی ہے اسکا نقشہ راقم مضمون نے ان الفاظ میں کھینچا ہے "ممکن ہے ہمارے اس آرٹیکل کو پڑھکر بعض اصحاب یہ کہیں کہ تم نے آریہ سماج کی کمزوریوں کا ذکر کرتے وقت آریہ سماج کے عملی کاموں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ دیکھو کتنے سکول اور کالج اور گورو کل چلے رہے ہیں ودھواؤں کی شادیاں ہو رہی ہیں۔ یہ کیسے سرسبز منظر ہیں۔ بے شک یہ سرسبز منظر ہیں مگر آتش فشاں کی چوٹی یا اسکی ترائی کے منظروں کو دیکھکر کیا وہ شخص کبھی خوش ہو سکتا ہے جو یہ جانتا ہے کہ پہاڑ کے اندر آگ سلگ رہی ہے جب ہی خروج ہوگا یا ہوتا ہے یہ تمام منظر ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں"۔ سماج کی خانہ جنگی کے متعلق بھی چند ریمارک نقل کرنیکے قابل ہیں۔ "آریہ سماج کی تباہی کے دیگر اسباب میں سے ایک اسکی خانہ جنگی بھی ہے۔ آریہ سماج کی خانہ جنگی کو دیکھکر بعض لوگ سخت حیران ہو رہے ہیں۔ کہ اس کے بیڑے کا کیا حشر ہوگا بعض لوگ اسکو زندگی کے آثار کہکر تسلی پا لیتے ہیں بے شک یہ زندگی کے آثار ہیں مگر کیسی زندگی؟ وہ جو دم واپسین ہو۔ بھیڑیے کے مونہہ میں پھنسا ہوا انسان بھی اپنی چیخ چلاہٹ اور ہاتھ پاؤں مارنے سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ میں ابھی زندہ ہوں مگر اسکی زندگی کے دم گنے جا چکے ہیں۔ مست ہاتھی کے پاؤں تلے آیا ہوا انسان بھی زندگی کی علامات کا ثبوت دے سکتا ہے۔ مگر اسکی زندگی کی گھڑیاں گنی جا چکی ہیں موت کے مونہہ میں پھنسا ہوا انسان نزاع کی حالت میں بڑبڑاتا ہوا اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ اس میں زندگی ہے مگر وہ زندگی چراغ سحری سے بڑھکر وقعت نہیں رکھتی زندگی کی ان علامات نے آریہ سماج کو تحت الثریٰ میں پہنچا دیا ہے اس زندگی سے موت اچھی ہے۔ لوگ آریہ سماج سے بیزار ہو رہے ہیں ان کا بیزار ہونا بالکل بجا ہے"

یہ تو حال ہے پنڈت دیانند صاحب کے جانشینوں کا۔ اب سوال یہ ہے کہ خود بانی سماج نے کیا کامیابی حاصل کی اور جو مذہب بنانیکی تجویز کی تھی اس میں انکو کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے متعلق دھرم پال صاحب لکھتے ہیں کہ "ان کے دماغ میں ایک ایسی مکمل سوسائٹی بنانیکا ڈھانچہ موجود تھا جو آفات زمانہ سے بری رہ سکے۔ اور سچے معنوں میں ویدک دھرم کا مظہر سمجھی جا سکے"۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اس "غضب کے دماغ" نے جس سوسائٹی کا نقشہ تراشا تھا وہ سوسائٹی بنا کر بھی دکھائی؟ اسکا جواب دھرم پال صاحب نفی میں دے چکے ہیں۔ پس اس سے صاف نتیجہ نکلا کہ پنڈت دیانند صاحب ناکام مرے اور جس کام کو انہوں نے کرنا چاہا تھا وہ نہ صرف خود ہی اسکو پورا کرنے سے پہلے ایک ناکامی کی حالت میں دنیا سے اٹھ گئے بلکہ انکے جانشینوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس کام کے پورا کرنیکے لیے توفیق نہیں دی۔ پس جو مشن آریہ سماج لیکر دنیا میں نکلا تھا اس میں صریح نامرادی کا ٹیکا اسکے ماتھے پر لگ چکا ہے اور اب وہ

دھونے سے دھل نہیں سکتا۔ یہ فرق ہوتا ہے خدا کے فرستادوں میں اور ان لوگوں میں جو اپنے دماغ سے تجویزیں ایجاد کرکے مذہب بنانا چاہتے ہیں۔ کوئی انسان اپنی کوششوں سے پاکیزگی حاصل نہیں کرسکتا بلکہ خدا کا فضل ہی اس مرتبہ پر اسے پہنچا سکتا ہے۔ پس جن لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ خدا کچھ چیز نہیں۔ اور مادہ اور روحوں کو جوڑنے کے سوائے اس کا کچھ کام نہیں۔ اور جن میں سے ایک ایک آدمی فرعون بے سامان ہو رہا ہے۔ انکی اندرونی زندگیاں کیونکر پاکیزہ ہوسکتی ہیں۔ دھرم پال صاحب نے تو بہت کوشش سے یہ ثابت کیا ہے کہ آریہ سماج کی اندرونی زندگی نہایت ناپاک ہے اگر وہ ہم سے پوچھتے تو ہم انکو پہلے ہی بتا دیتے کہ جس مذہب میں نیوگ جیسے گندے مسئلے پر عمل ہوتا ہے اس میں پاکیزگی اور طہارت کہاں آسکتی ہے۔

اسلامی بنک کی تجویز۔

اسلام کے پاک اصول اور احکام کو طرح طرح سے نیست و نابود کرنیکی کوششیں کی جارہی ہیں۔ کہیں برائے نام مسلمان نماز روزوں کے درپے ہیں کہیں حج زکوٰۃ اور قربانیوں کو موقوف کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑا عرصہ ہوا ایک مسلمان اخبار میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ پانچ نمازوں کی بجائے دو نمازیں کردی جائیں تو بڑی آسانی ہو جائیگی اور بہت سے لوگ جو پانچ نمازیں پڑھنے سے گھبرا کر بالکل نماز کو خیرباد کہہ بیٹھے ہیں دو ہی نمازیں پڑھ لیا کریں گے۔ قاری سرفراز حسین صاحب نے یہ تجویز کی تھی کہ پتلون کوٹ نکٹائی پہنے پہنے کرسیوں پر بیٹھکر نماز ہو جایا کرے اور روزوں میں کچھ ریفرشمنٹ ہو جایا کرے تو کوئی حرج نہیں۔ بلکہ جنٹلمین بھی شریک ہو جائیں گے۔ اسی قسم کی تجویز بعینہٖ انہی دلایل کو استعمال کرکے مولوی انشاء اللہ صاحب اور ڈپٹی سردار احمد صاحب نے پیش کی ہے۔ یہ تجویز ایک اسلامی سودی بنک کے قائم کرنیکے متعلق ہے۔ چنانچہ ۶ ستمبر ۱۹۰۶ء کے وطن میں ذیل کا لیڈر نکلا ہے۔ جسے میں پورا نیچے نقل کرتا ہوں تاکہ ناظرین خود بھی مولوی انشاء اللہ صاحب کی منطق کو دیکھ لیں۔

"ڈپٹی سردار احمد صاحب نے بنک کے قیام کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے ضمناً سلطانی بنکوں کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس پر ایک مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ "حضرت سلطان بیشک ہمارے سرتاج ہیں۔ لیکن انکی سلطنت میں اور کونسا شرعی قانون نافذ ہے کہ انکا یہ فعل ہمارے لیے سند ہو سکے سلطان پر کیا موقوف ہے اسوقت کسی اور اسلامی ملک میں بھی شرعی حدود جاری نہیں تو کیا اس سے یہ لازم آئیگا کہ مسلمان شرع کو چھوڑ دیں"۔ وطن اس موقع پر فاضل معترض سے کوئی لمبی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ الزاماً یہ لکھتا ہے کہ جب دیگر شرعی حدود کو نظر انداز کر دینے کے باوصف محکوم و آزاد ممالک کے مسلمان برابر مسلمان رہ سکتے ہیں تو بنکوں کے متعلق نئے اجتہاد پر عمل پیرا ہونیسے بھی انکی مسلمانی میں فرق نہیں پڑنا چاہیئے اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم میں غور و تدبر کرنا چھوڑ دیا ہے اور صرف چند الفاظ کو مدنظر رکھکر کلام اللہ کے باقی حصہ اور

تعلیم اسلام کی اصل روح کو بھلا دیا ہے۔ سود کے مسئلہ کو لو۔ اوّل تو ربا کے معنی میں ہی اختلاف ہے۔ ایک فریق اُسکے معنے یوژری ظالمانہ بیاج کے کرتا ہے۔ اور تجارتی شرح کے سود کو اُس سے خارج سمجھتا ہے۔ اور مخالف اسکے اس استدلال کا کوئی شافی جواب نہیں دے سکے۔ دوم وہ یہ نہیں سوچتے کہ کئی علمائے سلف و حال خود ربا کا بھی چند صورتوں میں غیر ممنوع ہوجانا تسلیم کرچکے ہیں۔ مگر اس کے معنی خواہ کچھ ہوں اوسکی ممانعت کی اصل وجہ ہمدردی پر مبنی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان کو روپیہ کی ضرورت ہے اور اُسے بازار سے کسی طرح ایک روپیہ سیکڑہ سے کم سود پر قرض نہیں مل سکتا۔ اور ادھر کوئی مسلمان بطور قرض حسنہ روپیہ دینے پر تیار نہیں۔ تو اگر کوئی مسلمان اوسے محض بہ خیال ہمدردی و تعلق اسلامی ۱۰ ار سیکڑہ سود پر روپیہ دیدے۔ تو کیا اوس نے منشاء الٰہی کے خلاف کیا؟ یا ۶ ر سیکڑہ کم لینے سے منشاء الٰہی کو قدرے پورا کیا؟ حالات زمانہ اور نکبت قومی کے اثر سے جس سے اس وقت شاید ہی کوئی بشر بچا رہا ہو۔ اگر وہ اسقدر ہمدردی نہیں کرسکا کہ بالکل بلا منافع دے۔ تو کیا اوس کے اسقدر احسان کرنیکا یہ صلہ ملنا چاہیئے۔ کہ اوسے اُلٹا مطعون کیا جائے۔ جسکا بدیہی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ آئندہ وہ کسی کو قرض نہ دے گا۔ اور مسلمان ضرورت مند کو پوری شرح پر غیر اقوام سے قرض لینا پڑیگا۔ اسلام تو یہ کہے کہ لاضرر ولا ضرار فی الاسلام اور ہمارے مولوی دو مسلمانوں کے صریح نقصان کو عین مقتضائے اسلام قرار دیں؟ ربا بیشک حرام مطلق ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے۔ پہلے مسلمان تو بنو۔ جب مسلمانوں میں پھر نور ایمان ایسا مضبوط ہوگیا کہ وہ اپنی ضرورت پر اپنے ہمسایہ اور بھائی کی آسایش کو مقدم رکھنے لگیں۔ تو ربا خود بخود حرام ہوجائیگا۔ مگر اس زمانہ میں جبکہ اپنی آسایش کو کوئی بھی مسلمان اپنے بھائی کی اشد ضرورت کے لیے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوسکتا۔ ربا (سنگین سود در سود) نہیں۔ معمولی تجارتی شرح سود کے جواز عدم جواز پر مُصر رہنا دماغی جمود۔ قومی نکبت و ذلت فضول پرخاش جوئی اور موشگافی کی عادت بد کی اونہی بیشمار نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ جو ہم مسلمانوں کی بانٹ بانٹ میں چند صدیوں سے ہویدا ہو رہی ہیں۔ بہرحال یہ ایک اجتہادی امر ہے۔ جو اسمیں قباحت نہ دیکھیں شامل ہوں۔ اور جنکو کوئی شرعی یا عقلی حجت و عذر ہو۔ وہ الگ رہیں۔ سردار صاحب کی رائے ذاتی نہیں۔ کئی جلیل القدر علماء بھی یہی خیال و رائے رکھتے ہیں۔"

یہ مضمون کسقدر بے سروپا ہے ایک ہی دفعہ پڑھنے سے معلوم ہوجاتا ہے۔ اول تو لکھا ہے کہ شرعی حدود کو نظرانداز کردینے کے باوصف مسلمان برابر مسلمان رہ سکتے ہیں۔ اسوقت شائد مولوی انشاء اللہ صاحب کا عمل اس شعر پر ہے

؎ زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں + کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہ گیا۔ سچ ہے مسلمانی ایسی کچی چیز تو نہیں کہ قرآن شریف پر عمل کرنا چھوڑ دینے سے اس میں کوئی فرق آجاوے۔ پھر لکھا ہے کہ اصل میں قرآن کریم پر غور و تدبر سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس زمانہ میں شرعی حدود پر عمل کرنیکی ضرورت باقی نہیں ہے پھر ربٰو کے معنے سود در سود کیے ہیں اور تجارتی شرح سود کو اس سے خارج کیا ہے پھر حرمت ربٰو کی علت ہمدردی بتا کر یہ ظاہر کیا ہے کہ جتنا کم سود

کوئی لیگا اسیقدر زیادہ اس کی ہمدردی اپنے بھائیوں سے پائی جائیگی پس یہ اختیاری امر ہو گیا یعنی ایک روپیہ سود لینے والے کی ہمدردی سوچودہ آنے والے کی ہمدردی زیادہ ہوئی اور ۱۲ آنہ والے سے ۱۰ آنہ والے کی۔ جس سے یہ نتیجہ نکلا کہ پوری ہمدردی بغیر سود چھوڑنے کے نہیں ہو سکتی۔ اور حرمت ربو سے مطلق سود کی حرمت لازم آئی پھر لکھا ہے کہ ربا بیشک حرام مطلق ہے لیکن مسلمانوں کے لیے پہلے مسلمان بنو جس سے معلوم ہوا کہ ربا کے جائز ٹھہرانے والے مسلمان نہیں اور سب سے آخر لکھا ہے کہ معمولی تجارتی شرح سود کے جواز عدم جواز پر مُصر رہنا دماغی جمود قومی نکبت و ذلت وغیرہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ معلوم نہیں جس صورت میں آپ خود جواز پر مُصر ہیں اس کے کیا معنے ہوئے + اب ذرا اور غور کی نظر سے ان بیانات کو دیکھنا چاہیئے۔ کیا یہ سچ ہے کہ سلطان روم کا کوئی فعل ہمارے لیے قابل عمل ہے؟ یا جو شخص مسلمانوں میں سے بادشاہ ہو جائے اس کے افعال قابل پیروی ہو جاتے ہیں؟ جو شخص قرآن شریف کے کسی حکم کو توڑتا ہے اللہ تعالیٰ کی نظر میں وہ ویسا ہی قابل مواخذہ ہے خواہ بادشاہ ہو یا فقیر۔ ہاں بادشاہ فقیر سے زیادہ قابل مواخذہ ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھ اور بہتوں کو ہلاکت کے گڑھے میں گراتا ہے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کو آپ سمجھیں مگر ہم تو یہ صاف صاف دیکھ رہے ہیں کہ جب سے اسلامی بادشاہوں نے قرآن شریف کے احکام پر چلنا چھوڑ دیا ہے اسیوقت سے ادبار اور نحوست انکے سر پر آئی ہیں۔ اگر وہ اسلام کے احکام پر چلنے والے ہوتے تو ادبار کا مونہہ کیوں دیکھتے۔ سلطان نے اگر بنک جاری کیے ہیں تو محض عیسائیوں کی پیروی کر کے ممکن ہے کہ انہوں نے کسی مجبوری کی وجہ سے کیے ہوں بہرحال انکا فعل ہمارے لیے پیروی کے قابل نہیں۔ ہاں اگر مولوی انشاء اللہ صاحب یا ڈپٹی نذیر احمد صاحب یہ دکھاتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا کم از کم حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ نے کوئی سودی بنک جاری کیے ہوئے تھے تو یہ مسلمانوں کے لیے ایک دلیل بھی تھی۔ افسوس ہے کہ قرآن شریف کے صریح احکام کے خلاف سلطان روم کا عمل پیش کیا جاتا ہے سلطان پرستوں کے لیے اگر یہ کوئی دلیل ہو تو ہو مگر خدا پرست مسلمانوں کے لیے یہ جواز سود کی کوئی دلیل نہیں + اب ہم وطن کی "اصل بات" کو دیکھتے ہیں جس میں یہ الزام دیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے احکام قرآنی کے ظاہری الفاظ کو مدنظر رکھکر تعلیم اسلام کی اصل روح کو بھلا دیا ہے۔ اور اسکی مثال مسئلہ سود سے دی ہے۔ افسوس ہے کہ تیرہ سو سال تک اصل روح مسلمانوں کو معلوم نہ ہوئی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی (نقل کفر کفر نباشد) اس اصل روح سے بے خبر ہے۔ کیونکہ وہ بھی قرآن کریم کے ظاہری الفاظ کو دیکھکر ہر قسم کے سود کو حرام سمجھتے رہے ورنہ یہ نئے ایماندار کسی حدیث سے ثابت کر کے دکھا دیں کہ وہ تجارتی سود لے لیا کرتے تھے۔ اور صرف سود در سود کو حرام سمجھتے تھے۔ وطن کا یہ لکھنا کہ ربا کے معنے ظالمانہ بیاج ہیں یعنی دو روپے سیکڑہ یا اس سے زیادہ۔ اور تجارتی شرح سود اس سے خارج ہے اور کہ جو لوگ یہ معنے ثابت کرتے ہیں فریق مخالف انکا شافی جواب نہیں دے سکتا ایک سیاہ جھوٹ ہے۔ اور اگر وطن میں اپنی بات کا ذرہ بھی پاس ہے اور محض نیک نیتی سے وہ اسلام کے فائدہ کے لیے یہ کام کر رہا ہے تو وہ دکھا دے کہ وہ کونسے دلایل ہیں جنکی بنا پر یہ معنے کیے جاتے ہیں۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے اس لفظ کے یہ معنے ثابت ہیں

یا کسی صحابی یا تابعی یا تبع تابعی کے قول سے یا چاروں اماموں میں سے کسی امام کے اجتہاد سے یا کسی محدث کی رائے سے یا کسی لغت کی کتاب سے اگر ان میں سے کوئی ایک گواہ بھی مولوی انشاء اللہ صاحب پیش کر دیں تو پھر فریق مخالف سے تشفی بخش جواب بھی پاویں لیکن جب تک ایسی معنے کرنیکے لیے سوائے سر سید احمد خاں کی غلط رائے کے اور کوئی دلیل نہیں جس کی غلطی کو میں سود کے مضمون میں بڑے بسط سے ظاہر کر چکا ہوں تو یہ کہنا کہ ربا کے معنوں میں تجارتی شرح سود داخل نہیں پبلک کو دھوکہ دینا ہے۔ ہاں اور یہ معنے ثابت کرتے وقت یہ بھی دکھاویں کہ لغت عرب میں تجارتی شرح سود کے لیے اور کونسا لفظ ہے۔ اور قرآن کریم اور حدیث میں اس ناپاک تجارتی شرح کے لیے کہاں کہاں جواز کا حکم آیا ہے۔ اور یہ بھی ثابت کریں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم یا تابعین میں سے کون کون سے جلیل القدر انسان تجارتی شرح سود لیا کرتے تھے۔ اور اگر وہ ان باتوں میں سے کوئی بھی ثابت نہ کر سکیں تو ایک حق پسند آدمی کو یہ کہنا پڑیگا کہ وہ مسلمانوں کو بے ایمان بنانیکی کوشش کر رہے ہیں اور یہ کوشش انکی اس سے بھی ثابت ہے کہ ہمارے رسالہ کو جو اسلام پیش کرتا ہے غیر مسلموں میں پھیلانا گناہ سمجھتے ہیں اور اسکے خلاف آرٹیکل لکھتے ہیں۔ لیکن خود ولیم میور کی کتابوں کو جن میں اسلام کو ایک جھوٹا مذہب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ ایک مفتری اور قرآن شریف کو انسان کا کلام بنایا گیا ہے مسلمانوں میں پھیلانیکی کوشش کر رہے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھکر ینابیع الاسلام جیسی گندی کتاب کے اشتہار دیکر پھیلا رہے ہیں اور اپنی ایجنسی میں ان کتابوں کو فروخت کرتے اور دن رات انکے اشتہار شایع کرتے ہیں اور اس طرح پر دجال کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اور ان ذرایع سے وہ صرف مسلمانوں کو بے ایمان بنانیکی کوشش ہی نہیں کرتے بلکہ انسے ان کتابوں کی دو گنی تگنی قیمتیں بھی وصول کر رہے ہیں یعنی ینابیع الاسلام انگریزی جو ہر ایک عیسائی کتب خانہ سے عہ کو ملتی ہے آپ چار روپے کو بیچتے ہیں اور اسکی اصلی قیمت چھ روپے بتاتے ہیں اور میور کی خلافت جو چھ روپے کو ملتی ہے۔ دس روپے کو بیچتے اور اسکی اصل قیمت اس سے بھی زیادہ بتاتے ہیں۔ ایسا ہی دوسری کتابوں کا بھی حال ہے۔ شاید یہ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ جسطرح سود کے ناجائز طریق سے مال حرام کھانا انہوں نے جائز کر دیا ہے اسی طرح دوسرے ناجائز طریقوں کو جنسے مال حاصل کر سکیں وہ جائز سمجھتے ہیں اور غالباً چند دنوں میں قمار بازی بھی جواد پر اور حصول مال کے دوسرے ناجائز طریقوں کے جواز پر بھی فتویٰ دینگے۔ یا شاید زیادہ قیمت اس لیے وصول کرتے ہیں کہ مسلمان سود کے ذریعہ روپیہ کمائیں اور یہ مال ہ مال حرام بود بجائے حرام رفت کا مصداق ہو اور یا ممکن ہے کہ اسکی وجہ یہ ہو کہ انہوں نے چونکہ سود کے ذریعہ روپیہ کمانیکی ایک مفید تجویز مسلمانوں کو بتائی ہے اس لیے اسکا صلہ اس رنگ میں چاہتے ہیں۔ بہر حال کچھ ہی ہو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو غرق کرنیکی کوشش میں لگے ہوئے ہیں خدا انکو انکی اس ارادہ میں ناکام رکھے۔

ایک اور معقول وجہ جو جواز سود کی مولوی انشاء اللہ صاحب نے پیش کی ہے وہ سن لیجئے۔ کہتے ہیں کہ ممانعت ربا کی علت تو ہمدردی ہے۔ پس اگر کوئی پوری ہمدردی نہیں کر سکتا تو تھوڑی ہی کر لے۔ بہت خوب وہ تو جسنے کیا وہ آپ بھگتے گا

مگر کیا اس سے جواز سود کے لیے فتوی دینے کی دلیل پیدا ہوتی ہے۔ مولوی صاحب اور ڈپٹی صاحب ذرا غور فرمائیں۔ ایک شخص پانچ نمازیں نہیں پڑھ سکتا ایک یا دو ہی پڑھ لیتا ہے وہ تارک نماز سے اچھا ہی یا ویسا ہی اس سے تو ہمیں بحث نہیں مگر کیا اس بنا پر یہ فتوی درست ہوگا کہ مسلمان دو ہی نمازیں پڑھ لیا کریں پانچ کی ضرورت نہیں۔ ایک شخص رمضان میں دو تین روزے رکھتا ہے اس نے اچھا برا جو کچھ کیا اپنے نفس کے لیے کیا مگر کیا یہ فتوی درست ہوگا کہ سارے رمضان کے روزوں کی ضرورت نہیں تین چار بھی کافی ہیں اور انسے مسلمانی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ اور لیجئے حرمت خمر کی دلیل دی ہے انما یرید الشیطٰن ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ فھل انتم منتھون۔ پس آپ کی دلیل کی رو سے جو شخص تھوڑی شراب پیکر زیادہ عداوت اور بغض سے رکا ہے اور ذکر اللہ سے بھی تھوڑا ہی ہٹا ہے تو وہ زیادہ شراب پینے والے سے اچھا ہوا اور اس لیے اب یہ فتوی دیدو کہ تھوڑی شراب پی لینے میں یا تھوڑا جوا کھیلنے میں کوئی ہرج نہیں۔ بلکہ آپنے اسلامی سودی بنک کی تجویز تو کی ہے ساتھ ایک اسلامی شراب خانہ اور اسلامی قمار خانہ کا اشتہار بھی دیجئے اور اپنے بنک کی طرح جس میں ۱؎ سیکڑہ سود لیا جاویگا ان ہر دو کے متعلق یہ اشتہار دیدیں کہ اس شرابخانہ میں کسی مسلمان کو ایک پاؤ بھر شراب سے (یا آدھ پاؤ سے جیسا مزاج میں آئے کریں یا وطن کے ناظرین سے مشورہ کر لیں) زیادہ شراب نہیں دیجاویگی اسطرح پر جو مسلمان ہندوؤں کے شرابخانوں میں جاکر بدمست ہو کر شراب پی لیتے ہیں اور بہت روپیہ ضایع کرتے ہیں انکا فائدہ ہو جائیگا۔ اور اسلامی قمار خانہ کے متعلق یہ قاعدہ مقرر کر دیں کہ اس میں کسی شخص کو اپنی آمدنی کے دسویں حصہ سے زیادہ جوا کھیلنے کی اجازت نہ ہوگی اسطرح آپ ان مسلمانوں کو بچا لینگے جو ساری جائداد ہی قمار بازی میں کھو بیٹھتے ہیں۔ میرے نزدیک تو اسلامی سودی بنک کے ساتھ اسلامی شرابخانہ اور اسلامی قمار خانہ کا ہونا نہایت ہی ضروری ہے۔ آپ وطن میں اشتہار دیں تو بہت سے حصہ دار بھی پیدا ہو جائیں گے۔ کم از کم وہ روپیہ جو آپکی پہلی تجویز کے مطابق اشاعت اسلام میں صرف ہونا تھا وہ اسی اسلامی امداد میں صرف کر دیں۔ حج بھی ہو گیا اور بیوپار بھی۔ اور مزید براں مرزا صاحب کی مخالفت بھی اسطرح ہو جائیگی۔ اور ان باتوں میں کوئی شخص آپ کو مطعون کرنیکا حق بھی نہیں رکھتا کیونکہ اگر آپ کسی کو شرابخوری اور قمار بازی سے بالکل نہیں بچا سکتے تو آپ کا اسطرح پر تھوڑا بچا لینا ہی قوم پر بڑا بھاری احسان ہے۔ اسطرح پر آپ اسلام میں ایک یگانہ مصلح ہو جائیں گے۔

ایک اور دلیل جواز سود کی مولوی انشاء اللہ صاحب نے یہ دی ہے کہ ربا تو حرام مطلق ہے مگر ابھی مسلمان مسلمان ہی نہیں۔ اسلیے ابھی اسکے جواز میں کیا حرج ہے جب پورے مسلمان بنجائیں گے تو ربا بھی حرام ہو جائیگا۔ یہ بات البتہ معقول معلوم ہوتی ہے مگر اس میں کچھ نقص ہیں انکو بھی رفع کر دیجئے۔ مثلاً چونکہ مسلمان مسلمان تو ہیں نہیں اسلیے انہیں ابھی نمازوں سے بھی معاف رکھا جاوے اور رمضان کے روزے بھی ابھی انپر ایک بوجھ ہے جب مسلمان بنجائیں گے تو خود ان احکام کی بھی پابندی کرنے لگ جائیں گے۔ ایسا ہی اوامر و نواہی جسقدر ہیں ابھی انپر عمل کرنیکی مسلمانوں کو ضرورت نہیں

کیوں کہ وہ مسلمان ہی نہیں جب مسلمان بنیں گے تو خود قرآن شریف کے احکام کو مان لیں گے۔ پس سب مسلمان اخبار نویسوں کا جنکو آپکے نزدیک غیر مسلمان مسلمان کہنا چاہیئے یہ فرض ہے کہ وہ عام طور پر اخباروں میں اعلان کریں کہ اسلام کے کسی حکم کا ماننا ضروری نہیں کیونکہ ابھی مسلمان مسلمان ہی نہیں ہیں جب مسلمان ہوجائیں گے تو خود احکام قرآنی کی بھی پیروی کرنے لگیں گے۔ یہ مسلمان بنانیکی نہایت عمدہ تجویز ہے اور شاید اسی لیے آپ پیویکی کتابوں کی اشاعت کرتے ہیں کہ ابھی مسلمانوں کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ قرآن شریف کو خدا کا کلام مانیں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان رکھیں۔ بیشک یہ اسلامی سودی بنک کا دوسرا جزو لازم ہے اور یہ نتیجہ ہے آپکے قرآن کریم پر غور و تدبّر کا۔ خیر بہر حال آپ مسلمانوں کے ہمدرد ضرور ہیں مگر ہماری یہ دعا ہے کہ خدا آپ جیسا کوئی اور ہمدرد پیدا نہ کرے۔ آمین

ڈپٹی سردار احمد صاحب نے جو جواب مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کو لکھا ہے اسکی بہت سی باتوں کا جواب تو اس میں آگیا۔ ہاں ڈپٹی صاحب کا ایک سوال ہے جسے وہ لاجواب سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ اسوقت مسلمان تاجروں میں کثرت سود خواروں کی ہے۔ پس بہتر ہے کہ جواز سود کا فتویٰ دیا جاوے ورنہ رہی سہی تجارت بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی رہیگی۔ اسی طرح سے ایک نئی روشنی کا دلدادہ کہہ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں جنٹلمینوں میں کثرت بے نمازوں کی ہے۔ پس بہتر ہے کہ یہ فتویٰ دیدیا جاوے جیساکہ اکثر مغربی تہذیب کے شیدائی دے رہے ہیں کہ نماز ایک پرانے زمانہ کی جہالت کی رسم ہے اور نئی روشنی کے ساتھ نماز نہیں رہ سکتی اور دلیل اسکی یہی کہ اکثر جنٹلمین تارک صوم و صلوٰۃ ہیں۔ اور جسطرح سود کے مجوزیہ دلیل دیتے ہیں کہ مسلمانوں کا اس میں نفع ہے اسی طرح ترک صلوٰۃ کے مجوز یہ کہتے ہیں کہ نمازوں میں وقت یونہی ضایع ہوتا ہے اور یہی وقت کسی مفید دنیاوی کام پر لگایا جاسکتا ہے۔ انکے نزدیک پانچ نمازوں پر مُصر رہنا ایسی ہی دماغی جمود قومی نکبت وغیرہ کی نشانی ہے جیسے مجوزین سود کے نزدیک عدم جواز سود پر مُصر رہنا۔ پس ڈپٹی صاحب ایک ہی اصلاح کے کیوں درپے ہیں انہی دلایل کو استعمال کرکے وہ ایک سرے سے ہی مذہب اسلام پر ہاتھ کیوں نہیں پھیرتے۔ تا ہر روز انکو لکھنے اور فریق مخالف کو جواب دینے کی ضرورت نہ رہے۔ ڈپٹی صاحب کا یہ دعویٰ کہ تجارت بلا سود ہو ہی نہیں سکتی بالکل غلط ہی آخر صحابہؓ بھی حرمت سود کے حکم کے بعد تجارت کرتے رہے مگر کیا ثابت ہے کہ کبھی کسی نے سود لیا؟ وہ تو سود کو سؤر کے برابر سمجھتے تھے کیونکہ سود دینے والوں کے لیے یہ حکم تھا کہ فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر بہت سے مسلمان کسی حکم قرآنی کی خلاف ورزی کریں تو کیا اس سے وہ حکم منسوخ ہوجاتا ہی؟ یا اسکے خلاف کوئی دلیل قائم ہوجاتی ہے؟ اگر یہی صورت ہے تو بتائیں کہ کتنے فیصدی نماز پڑھتے ہیں کیا پھر یہ کہنا چاہیئے کہ مسلمان نماز نہ پڑھا کریں؟۔

بڑا زور مجوزان سود کا اسبات پر ہے کہ مسلمان سود دیتے ہیں تو لیں کیوں نہ؟ کیا ایک گناہ سود دینے کا کافی نہیں؟ جو ایک دوسرے کی ضرورت بھی انکے لیے سمجھی جاتی ہے اور پھر جس صورتمیں بنک تجویز کیا جاتا ہے وہ علی الاعلان قرآن کریم کے ایک حکم کے خلاف ورزی ہے حالانکہ جو شخص سود دیتا ہے وہ غالباً کسی مجبوری کی حالت

میں ایک گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جسے وہ چھپاتا ہے فرق دونوں صورتوں میں ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص نماز نہ پڑھے اور دوسرا علی الاعلان یہ اشتہار دے کہ مسلمانوں کو نماز نہیں پڑھنی چاہیئے ایک شخص شراب پیئے اور چھپائے اور دوسرا یہ اعلان کرے کہ مسلمانوں کے لیے شراب کا پینا جائز ہے اور ایک دوکان کھول کر لوگوں کو شراب پینے کے لیے بلادے - عموماً سود دینے والے ایک اضطرار کی حالت میں سود دیتے ہیں اور اللہ غفور رحیم ہے اگر چاہے تو انکو معاف کر دے - مگر کھلم کھلا قرآن کریم کے احکام کی خلاف ورزی کرنیوالا کبیرہ گناہ کا مجرم ہے - ہم اسے ایک اجتہاد سمجھنے کے لیے تیار ہیں - مگر آپ پہلے یہ دکھائیں کہ کونسی لغت میں یا حدیث میں ربا کے معنے سود در سود لکھے ہیں اور تجارتی شرح سود کو اس سے خارج سمجھا ہے اور اگر یہ نہیں دکھا سکتے تو قرآن کریم نے حرام ربا مطلق کیا ہے اور کوئی تخصیص حکم قرآنی میں نہیں پائی جاتی اور احادیث میں بھی ربا مطلق کو حرام کیا ہے اور صحابہؓ کا عمل بھی یہی تھا کہ انہوں نے نہ تجارتی شرح پر سود لیا نہ سود در سود - آخر اجتہاد کے لیے کوئی دلایل بھی تو چاہئیں - اور وہ باتیں جنکو ڈپٹی صاحب نے فخر کرکے مولوی محمد حسین کے جواب میں لکھا ہے وہ دلایل نہیں بلکہ ایسی بودی باتیں ہیں جو دلائل کے نہ ہونے پر گواہی دیتی ہیں - یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جن علماء نے ربا کے غیر ممنوع ہونیکا فتویٰ دیا ہے وہ صرف ایسے ممالک کے متعلق ہے جو دار الحرب کہلا سکیں اور وہاں بھی صرف کافروں سے لینا جائز ہوگا - اور دار الحرب صرف وہ ملک ہو سکتا ہے جہاں مسلمان امن میں نہ ہوں اور کفار کے ساتھ جنگ ہو - میں اس رائے کی غلطی کو بھی اپنے سود کے مضمون میں ظاہر کر چکا ہوں بہرحال اس اجتہاد سے وہ لوگ کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے جو سود کو عام طور پر جائز ٹھہراتے ہیں اور صرف یہ شرط رکھتے ہیں کہ شرح سود ظالمانہ نہ ہو - جسکی کوئی حد بھی معین نہیں کرتے -

---

ریویو

آریہ سماج کی دینی کتب میں جہاد کی تعلیم ۱؎ | مصنفہ دیو رتن - مطبوعہ جیون پریس دیو آشرم لاہور چھوٹی تقطیع ۱۴ صفحہ قیمت ۱؎

قرآن کریم کی دعائیں ۱؎ | جنہیں قاضی محمد ظہور الدین اکمل متوطن گولیکی - نے اردو میں نظم کیا - ۵۶ صفحے قیمت ۲؎

یہ کتاب عبد الحی صاحب عرب قادیان سے ملتی ہے -

کوکبہ مملوکی وملوکی | یعنی ہندوستان کے فرمانروایان مملوک و خلجی کی تاریخی کارنامے مؤلفہ مولوی سید ضمیر الدین احمد صاحب - ۱۶۸ صفحے - مجلد قیمت عہ - مطبوعہ مطبع احسن المطابع پٹنہ -

تعلیم الاسلام - | اس رسالہ کے دو نمبر نکل چکے ہیں جن میں نہایت لطیف تفسیر سورہ فاتحہ کی ختم ہو چکی ہے اور اب سورہ بقرہ کی تفسیر شروع ہوگی - اس کے علاوہ مدرسہ کے تازہ ترین حالات سے یہ رسالہ احباب کو آگاہ رکھیگا - قیمت صرف عہ رکھی گئی ہے یعنی ۲ ؍ فی رسالہ - مگر بغیر پیشگی وصولی قیمت جاری نہ ہوگا -

کے چھوٹے صاحبزادے کو یکایک سخت بخار ہوگیا اور ہر دو بن ران میں دو گلٹیاں بھی نکل آئیں جو صریح طاعون کی صورت تھی جس پر سب کو بڑا تردد ہوا۔ حضرت اقدسؑ نے اسیوقت فرمایا کہ یہی تعبیر اس خواب کی ہے جو کل مینے دیکھا اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق شفا دیگا۔ کیونکہ ایک تو رؤیا میں یہ دیکھا کہ دشمن اندر نہیں آسکا اور دوسرے اس رؤیا کے ساتھ ہی وہ الہام بھی تھا جو پہلے طاعون کے متعلق ہو چکا ہے۔ یعنی اس گھر کے اندر جتنے رہنے والے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو ایسی موت سے محفوظ رکھے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جلدی ہی صحت کی صورت پیدا کر دی۔ اخیری رؤیا میں انڈے کے ٹوٹنے سے موت کی طرف اشارہ تھا۔ مگر چونکہ تقدیر معلق تھی اللہ تعالیٰ نے دعا کی برکت سے اسے ٹالدیا۔ ۲۳۔ اگست ۱۹۰۶ء کے الہام میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ آجکل کوئی نشان ظاہر ہوگا۔ سو وہ وعدہ بھی پورا ہوا۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔ ۸۔ ستمبر ۱۹۰۶ء۔ وحی الٰہی بوقت فجر (۱) لوگ آئے اور دعویٰ کر بیٹھے شیر خدا نے انکو پکڑا اور شیر خدا نے فتح پائی۔ (۲) امین الملک جے سنگھ بہادر۔ (۳) رب لاتبق لی من المخزیات ذکرًا۔ ترجمہ۔ اے میرے رب رسوا کرنیوالی چیزوں میں سے کوئی باقی نہ رکھ۔ (۴) دن کے وقت کا الہام۔ پیٹ پھٹ گیا۔ (معلوم نہیں کہ یہ کس کے متعلق الہام ہے) (۵) رؤیا دیکھی کہ حضرت مولوی نورالدین صاحب نے ایک کاغذ بھیجا ہے جو پروف کی طرح ہے جو لڑکا لیکر آیا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کے حاشیہ پر سطر ہے ذرہ پڑھ لینا اُس کاغذ کے دائیں طرف کے حاشیہ پر لکھا ہے۔ دشمن نہایت اضطراب میں ہے"

زکوٰۃ

یہ اطلاع ایک اشد ضرورت کے موقع پر دیجاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کا روپیہ کچھ مدت سے الگ جمع کیا جاتا ہے جس میں سے اس سلسلہ کے بعض غریب طلبار کی جو کالجوں میں اور اس سکول میں تعلیم پاتے ہیں امداد کیجاتی ہے اور جس میں سے بعض ابن السبیل کی راہ کا خرچ اور غربا ربیکس کا کفن دفن کیا جاتا ہے۔ یہ تمام اخراجات اس فنڈ سے کیے جاتے تھے لیکن فنڈ میں اس وقت روپیہ ختم ہوگیا ہے جس سے ان غریب طلبار اور متذکرہ بالا ضروری اخراجات کے لیے سخت مشکل پڑ گئی ہے جو صرف اسی طرح دور ہوسکتی ہے کہ ہر ایک صاحب ذی ثروت اس کام کو اہم سمجھ کر اسکی طرف خاص توجہ کرے اور جو زکوٰۃ اس کے ذمہ ہے وہ امین زکوٰۃ فنڈ کے نام جلد ارسال کرے۔ کیونکہ دیر سے بہت اخراجات بند پڑے ہیں ان کا تدارک کیا جاوے ہم امید کرتے ہیں کہ اگر ہر ایک صاحب ذی ثروت نے کچھ بھی توجہ اس طرف کی تو ان اخراجات کے لیے اتنا کافی سٹاک جمع ہوجائیگا جو کئی مہینوں تک کافی ہوگا۔ نورالدین امین زکوٰۃ۔

رسالے کے متعلق ضروری اطلاع

(۱) آجکل وصولی چندہ کے لیے وی پی کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ اس سے پہلے بذریعہ رسالہ اور الگ اشتہار کے بھی

یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ۳۱- مارچ تک جن خریداران کا چندہ وصول نہ ہوگا انسے بذریعہ وی پی وصول کرنیکا اختیار ہر وقت دفتر ہذا کو ہوگا مگر اس اطلاع اور اشتہار کے علاوہ ہر مہینے کے شروع میں ان تمام خریداران کی خدمتمیں کارڈ بھی روانہ کیے جاتے ہیں جنکے نام اس مہینے میں وی پی کیے جاتے ہیں۔ مگر نہایت تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ بہتسے خریداران کارڈوں کو فضول سمجھکر انکے جواب میں خاموشی اختیار کرتے ہیں اور پھر وی پی انکاری کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر حساب میں کوئی غلط فہمی ہو یا کوئی اور دقت ہو تو فی الفور اسکا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میرے ایک وی پی کے انکاری کرنیسے کیا حرج ہے وہ غلطی کرتا ہے۔ کیونکہ ایک ایک وی پی کے انکاری ہونے سے اسقدر مجموعہ ہو جاتا ہے کہ بارہا یہ خیال آتا ہے کہ بغیر پیشگی چندہ لینے کے آئندہ کسی صاحب کے نام رسالہ جاری نہ کیا جاوے۔ اور غالباً اگلے سال اسی تجویز پر عملدرآمد کرنا پڑے گا اس سال یہ بہتر سمجھا گیا ہے کہ جو احباب بلاوجہ وی پی انکاری کریں انکو اُس ماہ کا رسالہ دوبارہ نہیں بھیجا جاویگا۔ نیز یہ بھی التماس ہے کہ جو صاحب یاد دہانی کے کارڈ پر منی آرڈر کرنا چاہیں انہیں چاہیئے کہ ایسے وقت منی آرڈر کریں جو دفتر میں اس مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے پہنچ جائے اور ایسا ہی خط و کتابت بھی ایسے وقت میں ہونی چاہیئے بعض احباب کے منی آرڈر ۲۰ تاریخ سے بھی پیچھے پہنچتے ہیں جب دفتر سے وی پی روانہ ہو چکے ہوتے ہیں اور پھر انہیں وی پی انکاری کرنا پڑتا ہے۔

(۲) اسی نقصان کے خیال نے جو بار بار کے تقاضوں اور وی پی کے انکار سے اٹھانا پڑتا ہے منتظمان رسالہ کو اسبات پر مجبور کیا ہے کہ آئندہ کسی خریدار کے نام بدون پیشگی وصولی قیمت بذریعہ منی آرڈر یا وی پی رسالہ جاری نہ کیا جاوے اس لیے جو صاحب خریداروں کے نام بھیجتے ہیں انکی خدمتمیں مودبانہ التماس ہے کہ جہاں وہ اسقدر ہمدردی سے خریدار پیدا کرتے ہیں یہ بھی کوشش کریں کہ وہ خریدار ایسے ہوں جو قیمت بذریعہ منی آرڈر پہلے بھیجدیں یا پہلا پرچہ انکے نام وی پی ہو۔ (۳) رسالہ باقاعدہ ۲۰ تاریخ کو ہر خریدار کے نام بھیجا جاتا ہے مگر ڈاکخانہ میں اسقدر بدانتظامی پھیلی ہوئی ہے کہ ہر مہینے بہت سی شکایات رسالہ نہ پہنچنے کی آتی ہیں۔ ایسے احباب جنکو وقت پر رسالہ نہ پہنچے فی الفور اطلاع دیا کریں۔ جو صاحب اگلے مہینے کی ۲۰ تاریخ سے پہلے اطلاع نہ دینگے۔ انکو شاید پھر مایوس ہونا پڑے۔ اس لیے اس کی طرف ضرور توجہ رکھیں۔

سلسلہ اعانت | دو ماہ سے فہرست اعانت دھندگان و خریدار دہندگان نہیں دیجا سکی جسکی وجہ عدم گنجایش ہے انشاء اللہ اگلے مہینہ سے ان فہرستوں کو باقاعدہ شایع کیا جاویگا۔ فہرست خریدار دہندگان ان مہینوں کی نہایت مختصر ہے جسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ احباب کی وہ توجہ خریدار پیدا کرنیکی طرف نہیں رہی جو ابتدائے سال میں تھی۔ امید ہے کہ جن احباب کو یہ موقع حاصل ہے کہ وہ کسی طرح سے خدمت سلسلہ کی کریں وہ اس طرف بھی خاص توجہ رکھینگے۔

عکس مکتوب آنحضرتؐ | چند کاپیاں عکس مبارک کی رسالہ سے بڑھی ہوئی دفتر میں موجود ہیں جنکے دوسری طرف موجودہ رسم الخط میں مکتوب کی عبارت سطر بسطر چھاپ دیگئی ہے تا ناظرین کو پڑھنے میں آسانی ہو۔ جو احباب لینا چاہتے ہوں وہ جلدی درخواست کریں قیمت ۱/ رکھی گئی ہے۔

مینجر

اعلان:- ہر ایک سامان کرکٹ ٹینس فٹ بال وجمنیسٹک وغیرہ مستری نظام الدین احمدی شہر سیالکوٹ سے مل سکتا ہے۔ مکمل فہرست مفت۔

مطبع میگزین قادیان دار الامان میں منیجر میگزین کے اہتمام سے طبع ہوا۔